آج کل کی کہانیاں

پبلیکیشنز ڈویژن

آج کل کی کہانیاں

مُرتّبین

شہباز حسین : عادل صدّیقی

پیش کردہ
خلیق انجم

پبلیکیشنز ڈویژن
وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ ہند

دسمبر ۱۹۷۹ء

سرِ ورق : جیون اڈلجہ

قیمت = ۱۱ روپے

شائع کردہ: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن، وزارتِ اطلاعات ونشریات، حکومتِ ہند
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

ملنے کے پتے : کامرس ہاؤس، کریم بھائی روڈ، بلارڈ پایر، بمبئی۔ ۴۰۰۰۳۸
۸ ایسپلنیڈ روڈ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۰۱
شاستری بھون، ۳۵ ہیڈوز روڈ، مدراس۔ ۶۰۰۰۰۶
بہار اسٹیٹ کواپریٹو بنک بلڈنگ، اشوک راج پتھ، پٹنہ

پرنٹر : اسکائی لارک پرنٹرز، ۱۱۳۵۵۔ عیدگاہ روڈ، نئی دہلی

U
553.08
S32A

فہرست

۱۔ لکشمی	صالحہ عابد حسین	۵
۲۔ راہ	واجدہ تبسم	۱۶
۳۔ دِل دریا	شرون کمار	۳۲
۴۔ مجھے پہچانو	رام لعل	۵۲
۵۔ نازو	قاضی عبدالستار	۶۷
۶۔ مُردہ آدمی کی تصویر	سریندر پرکاش	۷۲
۷۔ متی	کرشن چندر	۸۲
۸۔ ڈھکوسلا	عصمت چغتائی	۹۳
۹۔ میمنہ	غیاث احمد گدی	۱۰۳
۱۰۔ صدیوں کے لمحے	شوکت حیات	۱۱۵
۱۱۔ ایک اور سفر	جی۔ ڈی چندن	۱۲۸
۱۲۔ چابی کھو گئی	جیلانی بانو	۱۳۶
۱۳۔ رگِ سنگ	رتن سنگھ	۱۴۳
۱۴۔ کونپل سے پُرزے تک	اقبال متین	۱۴۸
۱۵۔ مقامات	جوگیندر پال	۱۶۰
۱۶۔ پالی ہل کی ایک رات	قرۃ العین حیدر	۱۶۸
۱۷۔ بھوگ	سلام بن رزاق	۱۸۸
۱۸۔ سوا نیزہ پر سورج	عابد سہیل	۲۰۰
۱۹۔ چُرایا ہوا سُکھ	ذکیہ مشہدی	۲۰۷
۲۰۔ صد ہزار قصّے	احمد یوسف	۲۱۵

عرضِ مرتّب

آج کل میں جو کہانیاں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی ہیں، ان کا ایک انتخاب ہم نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اس انتخاب میں ۱۹۶۳ء تک کی کہانیاں شامل کی گئی تھیں۔ موجودہ انتخاب میں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۸ء تک شائع ہونے والی کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں ہندوستان کے تقریباً سبھی ممتاز افسانہ نِگار شامل ہیں۔ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مجموعہ کہانیوں کا ایک نمائندہ مجموعہ بن سکے۔

کہانیوں کی تقدیم وتاخیر محض اتّفاقی ہے اور مدارج کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

(شہباز حسین)

صالحہ عابد حُسین

لکشمی

[illegible] کردہ
[illegible] انجم

”نام“۔

”لکشمی“۔

” کتنے دن کا ہے“۔

”تین مہینے کا“۔

”بچّے کے باپ کا نام“۔

”بائی۔ ایک ہو تو بتاؤں“۔

لہجے کی تلخی اور جملے کے کاٹ اس کے دماغ میں جا کر چبھ گئی۔ گھبرا کر اس نے سامنے دیکھا اسے لگا مرجھایا پھول، ٹوٹے کھنڈر، کچلا حُسن زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہے۔ اس عورت کے چہرے کی معصومیت کو معصیت نے دبا لیا تھا۔ کمان جیسے ہونٹوں پر لاتعداد ننھی ننھی لکیریں اور خراشیں پڑی تھیں۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ آنکھوں سے جیسے چنگاریاں اُٹھ رہی تھیں اور چہرے پر بیک وقت غم، غصّے، طنز حقارت بے بسی اور مجبوری کے جذبات ناچ رہے تھے۔ کبھی یہ عورت جسے لڑکی کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ بہت حسین ہوگی۔ مگر اب کوئی گلاب کو دونوں ہتھیلیوں میں مسل کر پھینک دے

کوئی تاج محل کو مسمار کردے کوئی مڈونا کی تصویر پر گندے رنگ اُچھال دے۔ لکشمی کے حسن کو بھی اسی طرح مسخ کردیا گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ نیم باز آنکھوں سے جنھیں گھنی سیاہ پلکوں نے ڈھک رکھا تھا ایسے زہریلے تیروں کی باڑھ نکل رہی تھی کہ اسے اپنے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہونے لگیں۔

اپنی پانچ سالہ مدت ملازمت میں اسے ایسے کئی کیسوں سے سابقہ پڑا تھا جو سماج کی ٹھکرائی کسی درندے کی ہوس کا شکار یا اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر حماقت سے اس گندے ماحول میں پھنسی تھیں۔ جسے سماج اپنے جسم کا پھوڑا سمجھتا۔ ناسور کہتا ہے مگر اس کا مناسب علاج نہیں کرتا۔ مگر اس لڑکی کے ہونٹوں پر طنز و حقارت کی جو لہریں آنکھوں میں غم و غصہ کا جو طوفان اور سارے وجود پر بے بسی کی سی کیفیت طاری تھی ... ... ایسے کیریکٹر سے وہ آج تک دوچار نہ ہوئی تھی۔

اس نے جلدی جلدی کام نپٹا لیا۔ پھر آہستہ سے اُٹھ کر لکشمی کے پاس آئی جو اب اکیلی بنچ پر بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

"لکشمی بائی۔ مَیں تم سے الگ باتیں کرنا چاہتی ہوں ... ... اپنے گھر کا پتہ ... ...

"گھر میرا گھر ہم بدنصیب عورتوں کے گھر نہیں ہوتا مس صاحب ——— وہ تو تم جیسی خوش نصیب لڑکیاں چھین لیتی ہیں۔"

"لکشمی بائی تم جہاں کہو وہیں میں تم سے ملنے آجاؤں گی۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" اس نے غصے کو دبا کر لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم اونچے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکیاں ان گندی نالیوں میں کیسے پڑ رہو گی۔ جہاں ہم جیسے موری کے کیڑے رینگتے ہیں۔ ... ...

"مگر لکشمی بائی میں جو کہتی ہوں ... ..."

"تم لوگ ہم ابھاگنوں پر اپنی نیکی اور پارسائی کا رعب جماتی ہو۔ پیسہ کمانے کے

لیے سوشل سروس کا ڈھونگ رچا کر ہمیں احساس دلاتی ہو کہ دیکھو ہم کتنے نیک کیسے شریف کتنے بلند ہیں تم سے پھر بھی کتنے اچھے ہیں کہ تمھیں ... ..."

"بہن مجھ پر بھروسا کرو۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ گلا بھر آیا تھا اور آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ لکشمی اسے دیکھتی رہی ... دیکھتی رہی ... ... دھیرے دھیرے اس کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ ہونٹوں کے گوشے کانپے آنکھوں میں آگ کی جگہ پانی نے لے لی۔ خلوص کی دو بوندوں نے اس کے چہرے پر سے ایک خول سا اُتار دیا۔

"بائی۔ میں یہ نہیں سہار سکوں گی کہ تم جیسی پوتر لڑکی اس کوڑے کے ڈھیر پر پیر دھرے ——— نہیں نہیں بائی میں تمھیں اپنا گھر نہیں دکھاؤں گی۔ کانپ کر اس نے کہا۔

"مگر میرا تو یہ کام ہی ہے لکشمی بہن۔ میں تو ایسے محلّوں میں جایا ہی کرتی ہوں۔"

"تم نے مجھے بہن کہا! بہن! آہ تو بہن۔ بہن کا یہ حال کیسے دیکھ سکے گی۔

"اچھا تم کل میرے گھر آجانا۔"

"تمھارے گھر جہاں تمھارے ماں باپ بھائی بہن ہوں گے؟ اس کی آواز میں ایسی حسرت، ایسا درد تھا جیسے کلیجہ چیر کر نکال رہی ہو ——— "تمھارے پاک مقدس گھر میں میرے گندے پیر ——— نہیں نہیں ——— بائی ——— مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے ——— مجھے کسی سے کوئی بات کرنا نہیں ہے۔ یہاں سب خود غرض ہیں ——— وحشی ہیں۔ درندے ——— بے درد ——— ظالم ——— ہوس پرست ... ..."

وہ چیخ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ تھک کر بنچ پر گر پڑی۔ دیکھا تو بے ہوش تھی۔

اسے موقع مل گیا۔ اسپتال کے جنرل وارڈ میں اسے داخل کرا دیا۔ منتظموں کی خوشامد کی کہ اس سے فی الحال کچھ پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ نرسوں کی منت سماجت کی کہ اس کا خاص خیال رکھیں اور ڈاکٹر سے کہا کہ اسے نیند اور سکون کی ایسی دوا دے کہ وہ آٹھ دس

گھنٹے آرام سے سو جائے۔

مگر جب وہ یہ سب کچھ کر کے گھر کی طرف جا رہی تھی تو اس کا سر بھاری جسم شل اور دل بے چین تھا۔ گھر پہنچ کر نہ اماں ابا سے باتیں کیں نہ چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ ہنسی کھیلی نہ اچھی طرح کھانا کھایا۔ رات کو دیر تک تو سو ہی نہ سکی۔ جب بہت دیر بعد آنکھ جھپکی تو بھیانک خواب دیکھتی رہی۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ ایک عورت جس کے جسم پر گندے پھوڑے ہیں اور کیڑے رینگ رینگ کر زمین پر پھیل رہے ہیں اس کے برابر کھڑی ہے۔ وہ ڈر کر پرے ہٹتی ہے تو عورت بھیانک قہقہہ لگا کر کہتی ہے —— "بچے کے باپ کا نام —— ایک ہو تو بتاؤں —— ایک ہو تو بتاؤں ——" اور پھر اپنا منہ اس کے منھ کے قریب کر دیتی ہے۔

اس نے چلانا چاہا مگر لگا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ رکھا ہے۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے گلے سے نکلی۔ عورت کی صورت خود اس جیسی تھی۔

اماں گھبرا کر اٹھ بیٹھیں —— "کیا ہوا بی بی —— ڈر گئی۔ آ میرے پاس آ جا۔"

اور جب وہ اماں کے سینے پر سر رکھ کر لیٹی تو لکشمی کا دھیان کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اگلے دن گیارہ بجے تک وہ اسپتال میں اپنے منصبی کاموں میں الجھی رہی۔ کئی کیس تھے۔ کسی کا یہیں اسپتال میں داخلہ کرانا تھا۔ ایک کو چھوت کی بیماریوں کے اسپتال میں داخل کرنے کا انتظام کرنا تھا۔ ایک اپریشن کا کیس تھا۔ وہ ان کاموں میں لگی تھی مگر اس کے ذہن میں لکشمی ہی کا خیال پورے وقت رہا۔ اور جب وہ سب کام نبٹا کر اوپر کی منزل میں لکشمی سے ملنے کے لیے چلی تو اس کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے کسی بچھڑی سہیلی سے مدت بعد ملاقات ہونے والی ہو۔

اس نے آہستہ سے پردہ ہٹایا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں صرف دو بڈ تھے

جن میں سے ایک اس وقت خالی تھا۔ کھڑکی کے برابر کے بڈ پر صاف ستھرے بستر پر گلے تک سفید چادر سے اپنا جسم ڈھانکے لکشمی لیٹی ہوئی تھی۔ سر ڈھلک کر تکیئے سے نیچے آگیا تھا۔ نفرت اور وحشت اور دکھ کے سیاہ سائے اس وقت اس کے خوابیدہ پرسکون چہرے سے بہت دور تھے۔ ہاتھی دانت کے سے زردی مائل سفید چہرے پر سیاہ پلکوں کا سایہ اور جٹی بھویں کتنی بھلی لگ رہی تھیں۔ کمان جیسے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر پلنگ کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ کر اس کا سبک نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی۔

لکشمی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا پھر بند کرلیں۔ جیسے خواب سمجھ رہی ہو۔ ذرا دیر بعد گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دیں۔ حیران حیران نظروں سے ہر طرف دیکھا۔ ہاتھ سے آنکھوں کو ملا۔ پھر نگاہیں آکر اس پر ٹک گئیں۔ نگاہیں جن میں حیرانی اجنبیت درد اور محبت کے رنگ یوں ملے جلے تھے جیسے آسمان پر قوس قزح کے رنگوں کا امتزاج۔ جن کو پہچانا جا سکتا ہے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اور پھر لکشمی نے اپنی دونوں باہیں پھیلا دیں 'دیدی' اور وہ جھک کر اس کے گلے سے لپٹ گئی جیسے مدّتوں بچھڑی بہنیں مل گئی ہوں اور ان دونوں کے بیچ ذات پات مذہب نسل ماحول سماج طبقے نیکی اور بدی کی جو دیواریں کھڑی تھیں وہ خود بخود مسمار ہوگئیں۔

اور لکشمی کی بپتا سن کر وہ سنّاٹے میں رہ گئی۔ اس نے گناہ کے گڑھے میں گری بہت سی عورتوں کی کہانیاں سنی تھیں جن میں کچھ حماقت کا شکار تھیں کچھ ہوس پرستی کی بھینٹ چڑھی تھیں، کچھ مفلسی کی ماری تھیں کچھ کے رنگے سیار شوہروں نے انھیں روپیہ کمانے کی مشین بنا رکھا تھا ——— اور یہ سب سن سن کر وہ غصّے سے لرز لرز اٹھی تھی مگر لکشمی کی داستان نے تو اس کے دل و دماغ کو شل کر دیا۔ اف دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ باپ خود اپنی معصوم بیٹی کو یوں بھینٹ چڑھا دے۔

اس کا پاک دیس تہذیب وتمدّن کا یہ گہوارہ روحانیت کا مامن امنِ عالم کا علمبردار ہزاروں سال کی سنسکرتی پر نازاں اس کا یہ پیارا یہ مقدس دیس —— اب بھی یہاں ایسی وحشت ناک رسمیں موجود ہیں اب بھی رواج اور مذہب کے نام پر ایسے کھیل کھیلے جا سکتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کسی بات کا یقین نہ کرے۔ مگر لکشمی مجسم اس کے سامنے تھی۔ وہ کیسے اپنے کو دھوکا دے۔

لکشمی کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش تھا۔

" دیدی کیوں پوچھتی ہو کون ہوں۔ کہاں کی ہوں۔ بس یہی سمجھ لو کہ اس بمبئی کی کسی گندی نالی میں جنم ہوا ہوگا۔ یہاں ہی پل کر جوان ہوئی ہوں گی جہاں ہر روز ایک نئے مرد سے رشتہ جوڑتی ہوں۔ ہزاروں ان بد بخت بیسواؤں میں سے مجھے بھی سمجھ لو جن کو بھانت بھانت کے مردوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ رنگ رنگ کے طرح طرح کی زبانیں بولتے مرد وحشی اُجڈ گنوار جاہل مرد اور مہذّب تعلیم یافتہ فیشن پرست مرد خدا جانے کہاں کہاں کے مرد —— دُور دُور دیسوں سے آئے غیر ملکی —— سبھی آتے ہیں اور ہم جیسی بدبختوں سے دل بہلا کر چلے جاتے ہیں۔ یوں سمجھو دیدی ہم ایسی بنجر زمینیں ہیں جن پر کوئی زم دل کسان ہل چلا کر بیج نہیں ڈالتا لہلہاتی کھیتی کی تمنّا نہیں کرتا بلکہ ہوس کے بندے ظلم وستم کے پھاوڑے چلا کر ہمارے ذہن جسم دل اور دماغ کو روندتے گزر جاتے ہیں اور مُڑ مُڑ کر نہیں دیکھتے —— میں نہیں جانتی دیدی یہ بدنصیب جان جو میری کوکھ میں پل رہی ہے۔ کب کیسے کہاں سے آئی۔ یہ بدنصیب معصوم رُوح جس کا کوئی باپ نہ ہوگا۔ کوئی گھر نہیں ہوگا۔ کوئی عزّت نہیں ہوگی۔ آہ —— جس کا اپنا کوئی دوش بھی نہ ہوگا۔"

پھر وہ تکیے میں مُنہ چُھپا کر پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگی۔

لیکن وہ آج ارادہ کر کے آئی تھی کہ لکشمی کی کہانی سُن کر اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا کرے اور ہو سکا تو اس کی بہتری کی کوئی صورت نکال کر ہی واپس

جائے گی۔ اور آخر وہ کئی گھنٹے صرف کرنے کے بعد اس کوشش میں کامیاب ہوئی۔ اگرچہ جب شام ڈھلے وہ واپس اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو اپنے دل کا سکون لٹا چکی تھی۔ اس تیس سالہ کنواری شریف زادی کو اس دن یہ محسوس ہوا تھا جیسے اس کی اپنی بیٹی اس کیچڑ میں دھکیل دی گئی ہو۔

بڑی کوشش کر کے میں نے اپنے ماضی کو بھلایا ہے۔ ان ناموں کو ذہن سے کھرچا ہے جنھوں نے مجھے جنم دیا تھا۔ اس علاقے کو بھولی ہوں جہاں کی سوندھی پوتر مٹّی میں گھروندے بنا کر بچپن بتایا تھا۔ دیدی میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ کبھی میرا اپنا کوئی سندر گاؤں تھا جس کی سہانی رت میں پیڑوں کی چھایا میں میں نے سکھیوں کے ساتھ جھولے ڈالے تھے۔ میں ان پھولوں کی بو باس یاد کرنا نہیں چاہتی جن کو بالوں میں سجاتی تھی ان ندیوں کی جھنکار جن کے آئینے میں اپنے حُسن کی بہار دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی ان پنچھیوں کے مدھر چہچہے اور کلکاریاں جن کو سُن کر سپنوں کے دیس بساتی تھی۔ ہاں ہاں میں نہیں یاد کرنا چاہتی۔ اپنی پانچوں بڑی بہنوں کا لاڈ پیار اس ابھاگن ماں کی ممتا جو مجھے سب سے زیادہ چاہنے کا ڈھونگ رچاتی تھی۔ اس پاپی باپ کے کندھے کی سواری جس سے مجھے اتنا پریم تھا اور جس کی بدولت آج بھی اس حال کو پہنچی ہوں اس ننھے منّے بھائی کی موہنی صورت جس کے جنم لینے کی قیمت ایک کنواری پوتر کنیا کی لاج سے چکائی گئی ... ... دیدی —— دیدی میں بھول گئی تھی اپنے لچھمن کی وہ پریم بھری نگاہیں وہ شہد جیسے بول اور مضبوط و توانا جسم اور اس کی وہ ڈینگیں کہ وہ اپنی لچھی کے لیے ساری دُنیا کو چھوڑ سکتا ہے۔ ساری دُنیا سے ٹکر لے سکتا ہے ... ... میں اپنے کو یہ یقین دلاتی رہی ہوں کہ وہ کوئی سپنا تھا میرے تخیّل نے کوئی افسانوی دُنیا گھڑی تھی۔ مگر ہائے یہ پاپی من —— یہ تو کبھی نہ مانا۔ ہاں دیدی یہ سب باتیں کبھی ٹھوس حقیقت تھیں۔ اسی سورگ میں تمھاری بدنصیب لکشمی نے اپنا بچپن اور نوجوانی کا سُندر

دُور گزارا تھا۔

اپنے وطن کا نام نہ بتاؤں گی۔ سارے جہاں کی رُسوائیاں سہار کر بھی میں اس پیاری پوتر سرزمین کا نام بدنام نہیں کرنا چاہتی۔ جہاں مَیں نے جنم لیا تھا۔ ہائے یہاں سے بہت دُور مہا ساگر کے کنارے کھجور اور تاڑ کے پیڑوں کی چھایا میں میرا سُندر گاؤں اب بھی وہاں کی معصوم کنواریوں کی سورگ بنا ہوگا۔

"بڑا اونچا بڑا پُرانا پریوار تھا —— چاند سورج سے ناتا جوڑنے والا بڑی پُرانی رسمیں اب بھی وہاں موجود تھیں۔ پھر بھی میرے باپ نے اپنی لڑکیوں کو دیسی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی پڑھوائی۔ شاید اس لیے کہ بیاہ کے بازار میں اُونچی قیمت لگ سکے۔

ایک کے بعد ایک ایک دو دو سال کے وقفے سے ہم چھ بہنیں پیدا ہوئیں۔ مَیں سب سے چھوٹی تھی۔ میرا باپ ہر بار بیٹے کی آس لگائے تیاریاں کرتا مُرادیں مانگتا اور ہر بار مایوس ہو کر غصّے سے پاگل ہو اُٹھتا جس کا خمیازہ میری گائے جیسی بے زبان ماں کو بُھگتنا پڑتا۔ بیٹا جو لوک پرلوک میں اس کی نجات کرائے گا اسے نصیب نہ ہوا اور بیٹیاں یہاں بھی نرک ہیں اور شاید وہاں بھی نرک ہی نصیب ہو۔ ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ وہ دعائیں اور دوائیں کرتا رہا مگر میرے بعد ماں کی کوکھ ہری نہ ہوئی۔

"اور آخر اس نے نیا بیاہ رچایا۔ ساٹھ برس کے بڈھے کو دولت کے بل پر پندرہ برس کی کنیا مل گئی۔ اب تک وہ سب باتوں کے باوجود اپنی بیٹیوں کو بہت چاہتا تھا مگر اب —— اب نئی بیوی کے چاؤ چونچلوں اور بیٹے کی تمنائیں وہ سب کچھ بھول گیا۔ مگر کئی سال گذر گئے۔ نئی ماں کے کوئی بچّہ نہ ہوا۔ باپ منتیں مرادیں اور زیادہ کرتا گیا۔ اور پھر پھر ... ."

اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ لرز اُٹھی۔

”ایک بار یہ سب کہہ ڈالو لکشمی تو تمھارے دل کو سکون مل جائے گا۔“

”سکون میرے دل کو سکون۔ پاپوں میں گلے گلے ڈوبی ہستی کو تو شاید تمھارا بھگوان بھی سکون نہ دے سکے۔“

دُکھ بھری ہنسی کے ساتھ اس نے کہا اور خلا میں اسی انداز سے تکنے لگی جیسے اسے کچھ نظر آ رہا ہو۔

”آخر نئی ماں کا پاؤں بھاری ہوا۔ باپ کی خوشی اور بدحواسی کی انتہا نہ تھی۔ کہیں اس بار بھی جنم جنم کی بیری بیٹی نہ جنم لے اس فکر میں وہ گھُلا جا رہا تھا — اور اکثر اس نے کچھ ڈھونگی لوگوں کے سکھلانے سے ایک بہت پُرانی رسم کو تازہ کرنے کی منّت مانی —— بیٹے کے پیدا ہونے پر اپنی سب سے قیمتی سب سے سُندر سب سے پیاری شے بھگوان کو بھینٹ کرنے کی۔ سینکڑوں سال پہلے اس کے پریوار میں یہ رسم موجود تھی۔ پھر اب کیا ہرج تھا۔ اس کو کرنے میں بھلا جانتی ہو وہ شے کیا تھی —— باپ کے بیٹا ہوا۔ ماں دن رات روتی بہنیں گھبرائی گھبرائی نظر آتیں۔ مگر میں بہت خوش تھی۔ منا سا پیارا سا پیدا ہوا تھا نا۔ کیا جانتی تھی کہ یہ بھیّا نہیں کالا ناگ ہے جو مجھے ڈسنے آیا ہے ……

”اور بھیّا کے نام رکھنے کی شبھ گھڑی کے سمے باپ نے اپنی سب سے پیاری سب سے سُندر بھینٹ چڑھا دی۔ وہ مجھے سب سے زیادہ چاہتا تھا نا تو پھر بھگوان کے چرنوں میں کوئی گھٹیا شے کیسے بھینٹ کرتا۔ میں سب بہنوں میں سب سے سُندر بھی تو تھی بدنصیب۔

”سجا بنا کر —— ہزاروں اینڈی بینڈی رسمیں کرنے کے بعد حیران پریشان چودہ برس کی الہڑ نادان چھوکری کو ایک پُرانے کھنڈر کے راکھشس صورت کھوسٹ مرد کے سامنے لے جا کر مجھے بھینٹ کر دیا گیا۔

"آہ دیدی ــــ آج ــــ اس حال کو پہنچ کر بھی۔ وہ شرم ناک اور بھیانک گھڑی نہیں بھول پائی ہوں۔ میں روئی پیٹی چیخی چلائی سب کو مارا کاٹا اس راکھشس کو تو نیم جاں ہی کر دیا۔ مگر کبھی سُنا ہے تم نے کہ بھیڑیوں میں گھری ہوئی ان سے جیت پائی ہو۔

میرے باپ کو غیرت نہ آئی میری ماں نے ڈوب کر کنواں گندا نہ کیا۔ میرے منگیتر کا خون نہ کھولا۔ میری بہنوں نے شرم سے جان نہ دیدی آسمان نہ پھٹا زمین نہ دھنسی۔

" پھر ایک دن میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی کیا کچھ سہتی یہاں تمھارے بمبئی پہنچی عزت کی روٹی ــــ محنت کی کمائی ایسی جوان ایسی حسین اور پھر ایسی بد بخت کے نصیب میں کہیں نہ تھی۔ مگر خوب جگہ ہے یہ تمھارا بمبئی بھی ... ... یہاں ہر چیز کا سودا ہوتا ہے ہر شئے کا بیوپار۔ یہاں عورت کی قیمت ایک دو روپیہ بھی لگتی ہے اور ہزاروں لاکھوں بھی۔ اور تمھاری یہ ابھاگن لکشمی ہر قیمت پر بکی۔ اس کی لاج کے سودے کا لابھ ہمیشہ بیچ کے آدمی نے اُٹھایا ہے۔ اس کے دُکھ شرم کا پہاڑ میں نے جھیلا ہے۔ پر آج سے پہلے کسی نے یہ نہ پوچھا تھا کہ تو کون ہے۔ کیوں کر یہاں آپھنسی۔ کیا تیرا کوئی مرنا جینا نہیں جو یوں اپنا حُسن جوانی اپنی صحت اور لاج بیچتی پھرتی ہے۔

"ہائے دیدی یہ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔

لچھمن میرا عاشق میرا منگیتر لچھمن اس نے بھی تو مجھے ٹھکرا دیا جب میں اس نرک سے بھاگ کر نکلی تو سب سے پہلے اس کے پاس تو گئی تھی۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر ایسا گھبرایا یوں بھاگا جیسے میں کوئی چھوت کی بیماری ہو۔ دوسروں کے پاپوں کی سزا اس نے مجھے دی۔ اس کے ہم جنسوں کے کرتوتوں کا بدلہ خود اس نے مجھ سے لیا۔ دیدی ــــ یہ ممتا ــــ یہ پریم ــــ یہ نیکی ــــ بدی ماں باپ سب

جھوٹ ہے —— جھوٹ ہے دیدی —— جھوٹ ہے"۔

وہ سَر جھٹک کر جھوٹ ہے کی گردان کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ مُنھ سے جھاگ اُڑ رہا تھا۔

اس نے لکشمی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور زبردستی لٹا کر اس کا سَر اپنے زانو پر رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ سنبھلی اور پھر اس کے سینے میں مُنھ چھپا کر بچّوں کی طرح سِسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اور وہ اسے تھپکے جا رہی تھی۔ بس بس اب چُپ ہو جاؤ۔ شاباش۔ کیسی اچھّی بچّی ہے میری لچھمی بیٹی۔ ہاں اب ہم اپنی لچھمی کو نرس کی ٹریننگ دلوائیں گے —— اور پھر بھی وہ اسپتال میں کام کریگی۔ مریضوں کی خدمت دکھیوں کی سیوا میں وہ اپنا سارا دُکھ درد بھول جائے گی۔ اور ہاں پھر منا آئے گا۔ اور وہ مزے سے اپنے بچّے کے ساتھ رہا کرے گی۔ اور جب مَیں اِس کے پاس جایا کروں گی تو خوب میری خاطر کیا کرے گی اور ہم تینوں مل کر خوب کھیلیں گے۔ خوب کھیلیں گے —— خوب ہنسیں گے ... ... اور نہیں تو کیا ... ...

جانے کتنی دیر تک وہ اپنی گہری مدُھر دھیمی آواز میں یہ لوری سُناتی رہی پھر جو جُھک کے دیکھا تو لکشمی گہری میٹھی نیند کی آغوش میں تھی۔ شرم دُکھ غم اور غصّے کے سیاہ بادل چھٹ گئے تھے اور وہ ننھے بچّے کی سی معصومیت اور مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

وہ جُھکی —— ایک گہرا بھرپور بوسہ اس نے لکشمی کے چاند جیسے ماتھے پر ثبت کیا تو اس کی آنکھوں سے کئی تارے ٹوٹے اور لکشمی کے چاند جیسے ماتھے پر پھسل پڑے۔

واجدہ تبسم

راہ

دالان کی پچھلی طرف سے نرگس دوڑتی ہوئی اور ہانپتی ہوئی بولی "اے بی بی جلدی کیجئے جلدی چلئے صنوبر بچہ دے رہی ہے۔"

بڑی بیگم نے ایک زوردار دھڑاک کے ساتھ پاندان کے ڈھکنے کو گرایا اور کچھ مسکراتی کچھ جھلاتی ہوئی بولیں۔

"آج اس کی شادی کردو تو اگلے برس بچہ جننے کو تیار ہو جائے اور دیکھو تو کمبختیا کو بات کرتے بھر کا سلیقہ نہیں۔ مَیں پُوچھوں کیوں ری بچہ بھینس دیتی ہے یا عورت؟

ماما نے ہنس کر بی بی کی بات سے بات ملائی۔ "بی بی یہ آپ کا لاڈ پیار ہی تو ہے کہ شادی کے قابل ہوتے ہوتے بھی سب اپنے آپ کو بچہ ہی جانے ہیں اور بات کرنے کی گت بھی نہ آئے ہے۔"

مگر ماما کی بات پوری ہونے سے قبل ہی بڑی بیگم لپک جھپک اُنگلی سے ہلکا چونا چاٹتی نوکر خانے تک پہنچ چکی تھیں ـــــ وہاں دیکھا تو سچ مچ صنوبر کا حال تباہ تھا۔ درد کی شدت سے اس کا مُنہ پہلے سے ہرا نیلا پڑ چکا تھا ـــــ دائی اپنی سی کوشش کر کے ہار چکی تھی۔ صنوبر کا حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک جتنی مامائیں، نوکرانیاں ان کو ملنے جُلنے والیاں تھیں سب بدحواس ـــــ سبھوں کی زبانیں آپ ہی دُعا مانگے جا رہی تھیں۔

”مولیٰ نورخاں کا باغ ہنستا رکھیو۔“

”خدایا بچپن ہے۔ ارمان بھری جان ہے اپنا فضل کریو۔“

خود نورخاں باہر کھڑا ہوا جو اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ کیسے کیسے ارمانوں سے چاؤ چوچلوں سے بیاہ کر لایا تھا —— ابھی سال بھی تو نہ گزرا تھا —— دھان پان سی لڑکی نو مہینے بچّے کو سنبھالے پیلی پڑ چکی تھی۔ اللہ نے اسے اتنی استطاعت دی ہی نہیں تھی کہ پھل پھلاری دودھ گھی کھلا کر حاملہ کو صحت کی طرف پھیر لیتا اور غریبوں کے دن جس طرح گزرتے ہیں ایسے ہی نورخار، اور صنوبر کے بھی گزرتے تھے۔

ہاسپٹل لے جانے کا حویلی میں نہ تو رواج تھا نہ اس کی ضرورت ہی سمجھی۔ اپنے امّاں باوا نے ہی کون سے ہاسپٹلوں میں جنم لیا تھا کہ ہم انگریز میموں سے مشورے لیتے رہیں۔

”ارے خدایا مر گئی —— مولیٰ میری مشکل آسان کر دے۔“

صنوبر کی باریک اور تیز چیخ خدا نے سُن لی اور واقعی اس کی مشکل آسان کر دی — صنوبر کی چیخ کے ساتھ ہی ایک اور ننھی منّی سی چیخ اس دُنیا میں گُونجی —— دائی نے اعلان کیا

بیٹی ——“

لیکن دائی کی بات سُننے کی کسی کو فرصت نہ تھی۔ سبھی اور خاص طور سے بڑی بیگم اس خون کی ندیا کو سہم کر دیکھے جا رہی تھیں۔ جس میں کسی کی زندگی کی ناؤ ڈولتی ڈگمگاتی جا رہی تھی۔ ڈوبی جا رہی تھی۔

”ہائے میّا ——“ دائی سہم کر بولی۔ دیکھنے دکھانے کو تو سوکھے پتے سار پیلی تھی اور یہ ندی؟“

بڑی بیگم حیران پریشان پتھر کی مورت بنی کھڑی تھیں۔ وہ بڑی ہی حوصلے والی عورت تھیں۔ پریشانیوں کو مسکرا کر ٹال جانے والی بڑے سے بڑے اور کٹھن سے کٹھن لمحات بھی ان کی مسکراہٹ کو ملیا میٹ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی سوچ کا اندازہ سب سے نرالا تھا۔ اگر

وہ یُوں ہمت والی نہ ہوتیں تو اپنی اتنی زندگی بغیر مرد کے سہارے کے یُوں نہ گزار سکتیں۔ ان کی ساری زندگی یُوں ہی گزر رہی تھی کہ ایک دیوار آڑ بازو گھنگھرو چھنک رہے ہیں اور طبلہ دھنک رہا ہے۔ اس چھن چھن اور دھن دھن کے ہتھوڑے زندگی بھر اس دل پر ایسے پڑے کہ وہ فولاد بن کر رہ گیا۔ مگر اس وقت وہ سارے حوصلے بھول چکی تھیں —— یہ نہیں کہ انھوں نے آج تک کوئی موت نہ دیکھی ہو —— کون بشر ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی زندگی میں دو ایک بار حیات کا تار نہ ٹوٹتے نہ دیکھا ہوگیا۔ بڑی بیگم بھی کوئی الگ نہیں تھیں لیکن زندگی کا یہ روپ وہ آج پہلی بار دیکھ رہی تھیں جب کوئی اپنے جیون کا سارا رس کسی ایک ننھے منے پودے کو دیدیتا ہے کہ وہ پھلے پھولے اور خود فنا ہو جاتا ہے۔

بڑی بیگم نے بچّوں کے سے ڈر جانے والے جذبے کے ساتھ سہم کر صنوبر کی طرف دیکھا جس کا سونے کی طرح پیلا اور دمکتا ہوا چہرہ ابھی ابھی دائی نے سُرخ چادر سے ڈھک دیا تھا۔ وہ سُہاگن مری تھی نا۔ اسے ایک دُلہن کی طرح پورے سنگار چاؤ اور سرخ لباس میں دفنایا جائے گا۔ اسے ایک بار پھولوں کا گہنا پہنایا جائے گا۔ ایک بار پھر اس کا دُولھا اس کی ڈولی کو سہارے دے گا۔ وہ دُلہن بن گئی ہے نا۔

بڑی بیگم نے لرز کر دیکھا —— سامنے اس کا دُولہا کھڑا تھا۔ ابھی سال بھر پہلے جب بڑی بیگم خود بیٹے کی طرح پال پوس کر جوان کئے ہوئے اس بیٹے کو دولھا بنا کر دولہن بہو کو لانے کے لیے گئی تھیں تو یہی چہرہ خوشیوں اور اُمیدوں سے کس طرح چڑھتے سُورج کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا —— آج چہرے کا سورج غروب ہو چکا تھا اور دل کی وادیوں میں گھٹا ٹوپ اندھیروں کا راج تھا۔ دائی نے ننھی مُنّی سی گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر باپ کی گود میں دے دیا۔

باپ نے ایک لمحہ کو اسے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پھپک کر عورتوں کی طرح رو پڑا۔

"مَیں کیسے پالوں گا ـــــ مَیں کیا کروں۔ خُدایا۔"

ایک دم بڑی بیگم ہوش میں آگئیں۔ میاں کی بے وفائی سے ٹوٹا دل اُنھوں نے سدا دوسروں کے غموں کو اپنا جانا ـــــ یہ چیز رفتہ رفتہ ان کی عادت ان کی فطرت بن گئی اور اب یہ تھا کہ خدا ترسی کا ایسا جذبہ ان کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ وہ کہیں ایسے موقعے پر پیچھے نہ ہٹیں ـــــ ان کی اپنی تو لے دے کے دو ہی اولادیں ہوئی تھیں جو جوان ہونے کے بعد بیاہی بھی جا چکی تھیں۔ بیٹی تو اپنے گھر کی تھی اور بیٹا اپنے بیوی کے ساتھ گاؤں میں چھوٹے سے رجواڑے کو سنبھالے ہوئے تھا ـــــ اور بڑی بیگم کی زندگی کا اب یہی مصرف تھا کہ کسی یتیم لڑکی کو لے کر پال لیا کسی ناجائز اولاد کو کلیجے سے لگا لیا۔ کوئی بھیک منگی منگتی منگاتی حویلی کے دروازے پر آ نکلی تو اسے اپنے دامن میں پناہ دے دی۔ کسی نے لجاجت سے دو روٹی مانگی تو اُنھوں نے گھر کا کونا ہی دے دیا۔ بے پناہ دولت کا اُنھوں نے یہی خرچ کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ ان کی حویلی کیا تھی اچھا خاصہ لنگر خانہ تھا۔ پھر یہ تھا کہ پالی پوسی لڑکیوں لڑکوں کی شادی خود ماں بن کر کر رہی ہیں۔ زچگیوں میں عمل دخل دے رہی ہیں۔ کسی کی بسم اللہ کا ہنگامہ رچا رہی ہیں۔ کسی کی ختنہ کا دھوم دھڑکا مچا رکھا ہے۔ ایسے میں وہ گھونگھرو کے چھناکے اور طبلے کے دھماکے بالکل بھول چکی تھیں۔ وہ سوچتیں میرا دل تو دُنیا میں بہل ہی گیا۔ عاقبت بھی خدا ضرور روشن کر دے گا۔ کسی یتیم لیسیر کے سَر پر ہاتھ پھیر دینے سے اتنی ہی نیکیاں شمار ہوتی ہیں جتنی کہ اس کے سر پر بال ـــــ تو یہاں صرف سر پر ہاتھ پھیرنے کا سوال تو نہ تھا۔ وہ تو جسے بھی اپنی گود میں ایک بار لے لیتیں خدا کے بعد یہ اس کا واحد سہارا بن جاتیں۔ اس کی زندگی سنوار دیتیں۔ اس کی خوشیاں ان کی اپنی خوشیاں ہو جاتیں اور اس کا ہلکا سا غم بھی ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دیتا۔

نور خاں انھیں کا پروردہ تھا۔ بعد میں تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر انھوں نے اسے اپنی زمینوں کا حساب رکھنے کے لیے منشی کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کی شادی بھی انھوں نے

ہی اپنی پسند سے پارسال ہی کروائی تھی۔ اُنھوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ نئی نئی بہار سے بھری یہ بگیا دم بھر میں یوں اُجڑ کر رہ جائے گی۔

نور خاں حویلی سے ملحق مگر ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی حیثیت نوکروں کی سی نہ تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا اور دوسروں کے علاوہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اوروں سے ذرا ممتاز سمجھتا تھا۔ اس نے بڑی بیگم سے کہہ رکھا تھا اور بڑی بیگم نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ صنوبر کے ماں بننے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی زمین پر خود کاشت کر کے خود مختار زندگی گزار سکتا ہے۔ بڑی بیگم نے زمین بھی اس کے نام کر دی تھی۔ لیکن بیس ایکڑ زمین پر جا کر بسنے کی بجائے صنوبر نے پانچ ہاتھ ٹکڑے کو زیادہ ترجیح دی —— اب سارے ارمان دفن ہو چکے تھے اور وہ —— کہ جس کے دل میں ایک لمبی اور بھری پڑی زندگی گزارنے کا ارمان تھا —— کھڑا پُوچھ رہا تھا۔

”میں اسے کیسے پالوں گا؟ —— مَیں کیا کروں خدایا۔“

”لاؤ میاں اسے مجھے دیدو۔ مَیں نے تمھیں پال پوس کر بڑا کیا تو کیا اس ننھی مُنّی جان نہیں کر سکتی۔ ایک دم بڑی بیگم کا لہجہ اعتماد سے بھر گیا۔

نور خاں کے بہتے آنسو اک دم رُک گئے۔ ارے —— خدا کے بعد اس عظیم سہارے کو وہ کیسے بھول گیا تھا۔ وہ زندگی کو بوجھ کیوں تصور کر بیٹھا تھا۔ ان تجربہ کار ہاتھوں اور خدا ترس اور محبّت بھرے دل میں چُھپ کر تو یہ ننھی کلی دنوں ہی دنوں میں پھول بن جائے گی۔ میں کیوں کر فکر کرتا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر میں لپٹی ننھی سی جان بے حد محفوظ ہاتھوں میں دیدی۔

اس ذمّہ داری پر بڑی بیگم کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ اس قسم کی عظیم سے عظیم ذمّہ داریاں اپنے سَر لے چکی اور انھیں نبھا چکی تھیں لیکن یہ اپنی نوعیت کی پہلی ذمّہ داری تھی کہ اتنی ننھی سی جان کو جو ابھی چند گھنٹوں کی بھی نہ ہوئی تھی ان کے سایۂ عاطفت میں آئی۔ آج تک پلنے والے بچّوں میں کوئی دو سال سے کم کا نہ تھا لیکن

یہ جان جس نے ماں کے دُودھ کو مُنہ تک نہ لگایا۔ اوپر کے دودھ سے کس مصیبت سے پلے گی۔ لیکن ان کے کانپتے دل کو قرار اسی لمحہ آگیا جب اُنھوں نے ساتھ ہی یہ سوچا کہ "جتنی کٹھنائیاں مجھے پالنے پوسنے میں درپیش ہوں گی جنت اتنا ہی اونچا مقام مجھے ملے گا۔" اور وہ بے حد پُرسکون ہوگئیں۔

بڑی بیگم کی زندگی کا یہ دور سب سے جدا تھا۔ نئے نئے تجربے ہو رہے تھے نئی نئی مشکلیں نپٹنی پڑ رہی تھیں اور دل سمجھاتا تھا انھیں ننّھا منا روپ مت دو۔ یہ بڑے بڑے معرکے ہیں جو کہ تمھاری جنّت کو جانے والی راہوں کو استوار کر رہے ہیں۔ بڑی بیگم کے اپنے بھی دو بچے ہوئے تھے مگر ان بچوں کو پالنے اور اس بچی کو پالنے میں واقعی زمین آسمان کا سا فرق تھا۔ وہ ان کے خود کے بچّے تھے وہ ماں تھیں خود ہی اپنا دودھ پلاتی تھیں۔ اوپر کے دودھ کی کھٹ کھٹ اور مصیبت کا انھیں کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر یہ تھا کہ اپنے بچّے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ مارو ٹھونک دو غصّہ آئے تو پٹخ دو۔ کون بازپُرس کرنے چلا ہے۔ مگر اب وہ بات نہ تھی ہر چند کہ یہ بھی اپنی ہی بچی جیسی تھی مگر اس کی مسلسل رُوں رُوں سے تنگ آکر کبھی ان کا جی اسے ایک آدھ دھپّہ جڑ دینے کو چاہتا تو ایسا لگتا کہ خدا کی آنکھیں صرف انھیں پر مرکوز ہیں۔ اور وہ ڈگمگا جاتیں۔ "ایسے سے مجھے جنّت کیسے مل پائے گی" ان کے اپنے بچوں پر آیائیں تھیں۔ میاں لاکھ بے وفا اور بددل تھے مگر مرد کی ذات کا پورا کمینہ پن ان میں موجود تھا جو عورت کو تو جوتی تلے کی چیونٹی سمجھتا اور دبانا اپنا حق جانتا ہے مگر اپنی اولاد کو کلیجے کی کور سمجھتا اور اس کی آسائش اور آرام کا پورا خیال رکھتا ہے۔ نواب صاحب بھی بالکل مرد تھے۔ بیوی کو جتنی بے توجہی بخشی اولاد کو اتنی ہی توجہ اور محبّت کی گرمی دی۔ "ہیں" بھی آواز سُنتے تو دوڑے آتے کہ بچہ کیوں رویا۔ کیسے رویا۔ انھوں نے ایک ایک بچے پر دو دو آیائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ دودھ ماں ہی پلاتی تھیں نگرانی بھی ان کی اپنی ہی تھی۔ یہاں یہ اڑچن آن پڑی تھی کہ اگر آیا نہ رکھتیں تو خدا کے آگے جوابدہ

ہوتیں کہ اپنے بُرتے پر لیا تھا تو پھر آرام کی کیوں سوچی ـــــ ڈبے کا اوپر کا دودھ بنانا رات بے رات جگنا اپنے ہاتھوں کو موت کرنا۔ بس بڑی بیگم بن داموں کی غلام بن کر رہ گئیں۔

انھیں دنوں ایک دل ہلا دینے والا واقعہ رونما ہوگیا۔

نور خاں بیل گاڑی میں زمینوں پر سے حساب کتاب کی جانچ کرکے واپس آرہا تھا کہ بیل گاڑی اوبڑ کھابڑ راستوں سے پتھروں سے ٹکراتی نیچے آپڑی اور اس کے تلے نور خاں مرچی دھنیے کی طرح پس کر رہ گیا۔

جانے والا تو اپنی جان سے گیا مگر بڑی بیگم ذمّہ داری کے دوہرے بوجھ تلے دب گئیں۔ اب وہ ایک معصوم یتیم یسیر کی نگہہ دار ٹھیریں۔ کیسے کڑے مقام پر خُدا نے انھیں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ انھیں اس بوجھ سے اپنی کمر ٹوٹتی محسوس ہوئی مگر اس خدا ترسی کے جذبے اور جنّت کی آس نے انھیں سہارا دیا اور وہ تن من دھن سے جُٹ گئیں۔

ننّھی چونکہ ان کی عاقبت کی خوشیوں کا سہارا بن کر آئی تھی اس لیے انھوں نے اس کا نام مسرّت رکھا۔ ویسے تو انھوں نے اسے ہزار نام دے رکھے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک ماں سگی ماں اپنی سگی اولاد کو ہزاروں ہی پیار بھرے ناموں سے پکارتی رہتی ہے۔

بڑی بیگم نے اب تک جتنے بھی بچّوں کو پالا تھا یہ سمجھ کر پالا تھا کہ بس بچے ہیں۔ پل جائیں بڑے ہو جائیں اپنے اپنے ٹھکانوں سے بیٹھ جائیں۔ مگر مسرّت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ انھوں نے ایک دن ہر خاص و عام میں اعلان کر دیا کہ مسرت میری بیٹی ہے۔

کسی بات کو مُنہ سے کہ دینا اور ہے نباہنا اور ـــــ مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ بڑی بیگم نے مُنہ سے اگر یہ بات نکال دی تھی تو واقعی دل سے اسے نباہ کر ہی چھوڑا۔ زمانہ بدل رہا تھا۔ انھوں نے عربی اُردو تعلیم کے ساتھ ساتھ مسرت کے لیے ایک انگریز مس بھی رکھی جو اسے بے حد جانفشانی سے انگلش پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی سیون پردون، نٹنگ پکوان سلیقہ قرینہ غرض کہ کوئی بات ایسی نہ چھوٹی جس کا بڑی بیگم نے بطور خاص خیال نہ رکھا ہو۔ مسرت

ابھی آٹھ نو سال کی ہی ہوگی کہ اس نے خود بھی بڑی بیگم کی محبت کو پرکھ لیا۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی موقعے پر کوئی نہ کوئی پوچھ ہی بیٹھتا۔

”ارے ہے بڑی بیگم ـــــ آپ تو بچی کے پیچھے جان تباہ کئے دے رہی ہو،“ تو وہ مسرت کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتیں۔ ”وہ تو میری بیٹی ہے۔ اور یہ تو سوچو یتیم یسیر ہے۔ اس کے طفیل تو مجھے جنت ملے گی۔“

انھیں دنوں رمضان کے مبارک مہینے کی بات ہے۔ یو۔ پی سے ایک مولانا صاحب بطورِ خاص تراویح کی نمازیں پڑھانے کے لیے گاؤں بلوائے گئے۔ مہینے بھر تک انھوں نے ہر کس و ناکس کے منہ سے یہی بات سنی کہ بڑی بیگم کس قدر خدا پرست ہیں۔ کس طرح غریبوں کے لیے ان کی تجوری کا منہ کھلا ہوا ہے۔ کیسے کیسے انھوں نے اپنی زندگی تمام تر انھیں لوگوں کے لیے وقف کر رکھی ہے جو مصیبت کے مارے ہیں اور یہ کہ ایک یسیر اور یتیم لڑکی کو کس طرح جگر کا ٹکڑا بنا کر رکھا ہے۔

مہینے کی ختم پر جب وہ واپس یو۔ پی جانے لگے تو پردے کی آڑ سے بڑی بیگم سے بات چیت ہوئی۔ انھوں نے بغیر کسی قسم کی خوشامد چاپلوسی کے واقعی سچائی کے ساتھ کہا،

”بیگم صاحبہ آپ یہ سب جو کچھ کر رہی ہیں خدا کے ہاں آپ کی نجات ہی نجات ہے۔“

بڑی بیگم کی تشکر سے بھرائی آواز آئی ـــــ ”مولانا صاحب بس۔ یہی دعا ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے۔ دنیا کے مزے تو چکھ لیے اب آخرت کی دھن ہے۔

”ارے یہ آپ کیا کہتی ہیں۔ آپ کچھ نہ کرتیں لیکن صرف ایک یتیم یسیر لڑکی کو پال کر ہی آپ نے وہ کچھ کیا ہے جس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔

بڑی بیگم نے تڑپ کر بات کاٹ دی۔ ”مولانا صاحب اسے یتیم لڑکی کے نام سے نہ پکاریے ـــــ میری بیٹی ہے وہ ـــــ اسے اسی طرح مخاطب کیجئے جیسے وہ ...“ ان کی آواز پھوٹ بہی۔

"مرحبا، مرحبا۔" مولانا صاحب بے اختیار ہو کر پکار اُٹھے مُبارک ہیں آپ۔ مُبارک ہیں وہ در و دیوار جن کی پناہ میں آپ رہتی ہیں۔ مُبارک ہے وہ زمین جس پر آپ قدم دھرتی ہیں۔ آپ کی جگہ برحق ہے۔ جنّت میں آپ کا بلند مقام برحق ہے ..." اور وہ اللہ ہو۔ اللہ ہو کا ورد کرتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اس دن سے بڑی بیگم پر ایک نئی دُنیا کے دروازے کُھل گئے۔ ان کی محنت خُدا نے سپھل کر دی۔ اتنے بڑے مولانا فرما گئے کہ جنّت برحق ہے تو یقینی ہو گی۔ اور یہ سب نیک اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور یہ اعمال مسرّت کے قدموں کے طفیل ہیں۔ وہ اسے جی جان سے نہالنے لگیں۔

صالحہ ان کی اپنی بڑی بیٹی سال کے سال ماں کے ہاں گرمیاں گزارنے اور آم کھانے آتی تھیں ـــــ ماں نے مسرّت کو گود لیا تھا تبھی سے وہ کھٹکیں۔ لیکن مُنہ سے کچھ بول نہ پائی تھیں۔ جانتی تھیں کہ ماں نے زندگی بھر ہر طرح کے دُکھ سہے اب بڑھاپے میں دل بہلانے کی خاطر یہ سہارے پال رکھے ہیں۔ اور ان کی برابری کا کوئی جوڑی دار ہوتا تو شاید طوفان اُٹھا لیتا۔ مگر جانتی تھیں کہ جتنے ہیں سب ایسے ویسے ہی ہیں۔ کسی کے ماں باپ نے غربت کے مارے لا کر گود ڈال دیا ہے۔ کوئی حرام کا تھا تو کوئی کونے کھدرے نالے پرنالے سے برآمد کیا ہوا ہے۔ کوئی بھٹکتا بھٹکاتا گلے پڑ گیا ہے۔ لیکن مسرت کو جن چاؤ چونچلوں سے لیا تھا وہ دل بُرا کر دینے کے لیے بہت کافی تھا مگر ٹال گئیں۔ ہر برس آتیں اور جُدا رنگ دیکھ کر جاتیں۔ ماں نے جب اعلان کیا تھا کہ مسرّت بیٹی ہے تو ان کا ماتھا ٹھنکا اب تو یقیناً یہ بھی جائداد کی ایک وارث ٹھہری۔ مگر ماں کے آگے بھلا بول ہی کیا سکتی تھیں۔ لیکن اس سال تو پیمانہ ہی چھلک گیا۔ بڑی بیگم کی زندگی کا رُخ ہی مولانا صاحب نے پھیر دیا تھا۔ جب سے انھوں نے اتنے پہونچے ہوئے بزرگ کے مُنہ سے یہ بات سُن لی تھی کہ وہ جنّت کی واقعی مستحق ہیں ان کی محبت مسرّت سے کچھ زیادہ ہی سوا ہو گئی تھی۔ وہ یہ

دھوکہ کھا گئیں کہ اُنھوں نے اپنے مہر میں ملنے والی تمام جائداد بھی مسرت کے نام جیتے جی لکھ دی۔ جو کم و بیش سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی بنتی تھی۔ یہ وار ایسا نہ تھا کہ بیٹی چین سے سہار جاتیں۔ بھئی ظاہر ہے کہ اس کے بیچ میں یہ نصیبوں جلی مسرت نہ ٹپک جاتی تو یہ انھیں کا تو حق ہوتا نا۔ بڑے ارمان سے ماں سے کہا "اماں بیگم —— آپ نے بنا سوچے سمجھے اتنی بڑی جائداد مسرت کے نام کر دی۔ بڑی بیگم بے حد مطمئن انداز سے مُسکرائیں۔ تو کیا ہوا بیٹی تمہارے جہیز میں بھی تو کم و بیش ایک لاکھ نقد اور ایک لاکھ کا زیور کپڑا گیا ہے۔ وہ بھی تو میری ہی بیٹی ہے۔ رُکتے رُکتے صالحہ بولیں۔ "مگر اماں بیگم۔ گود لی ہوئی اور سگی اولاد میں کچھ تو فرق رکھتیں آپ —— کیا سچ مچ وہ میری برابری کر سکتی ہے۔ اور کیا سچ مچ آپ اسے مجھ سے زیادہ چاہ سکتی ہیں۔

اسی لمحے مسرت کسی کام سے ادھر آ نکلی۔ لمحہ بھر کو تو صالحہ بھی اسے دیکھ کر بات کرنی بھول گئیں۔ غضب خدا کا۔ کیا رنگ و روپ پایا تھا۔ کیا دبدبہ کیسی شان۔ کیسی پاکیزگی برس رہی تھی صورت پر۔ سچ ہے خدا حُسن کی دولت جسے چاہتا ہے دیدیتا ہے اس میں غریب امیر کی تخصیص نہیں رکھتا۔ بڑے بڑے پائنچوں کے گلابی غرارے گلابی فراک اور ہلکے سبز ڈوپٹے میں کیسی نکھر رہی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ انگ انگ کو چُوم چُوم لیں۔

بڑی بیگم ان کی بات کا جواب دے رہی تھیں۔" بیٹا محبت نفرت کا کیا ہے جانور کو پالو اس سے بھی ہو جاتی ہے اور دل پھر جائے تو سگی اولاد کی طرف ہونگنے تک کو جی نہیں چاہتا۔ مسرت کی بات ہی اور ہے۔ مَیں نے اسے جی جان کا ٹکڑا بنا کر پالا ہے۔ سچ کہتی ہوں اتنی محنت اور توجہ مَیں نے تم دونوں بہن بھائی پر بھی نہیں صرف کی تھی۔ مجھے سچ مچ اس کی اتنی ہی محبت آتی ہے جتنی تم دونوں کی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم سے بھی زیادہ —— اس کی یہی وجہ ہے وہ یتیم یسیر ہے۔ اسے مَیں نے جتنی محبت دی ہے اس کے صلے میں مجھے اتنی ہی نیکیاں ملیں گی —— وہ میری بیٹی بھی ہے۔ میری عاقبت، میری نجات

اور میری جنت کا راستہ بھی ——"

مسرت نے ایک ٹک رُک کر یہ ساری باتیں سُنیں۔ اس نے پہلے بڑی بیگم کی طرف دیکھا پھر صالحہ کی طرف —— مُنہ سے کچھ نہیں بولی۔

صالحہ بیگم بھی چُپ رہ گئیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

چند سال اور گزرے۔ مسرت نے شہر جاکر میٹرک کا امتحان بھی دیا اور پاس بھی ہوئی۔ اب بڑی بیگم کو اس کے مستقبل کی —— شادی کی فکر تھی۔ مگر خود مسرت چاہتی تھی کہ ابھی کچھ اور پڑھ لے۔ زمانہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ ایک دن بڑی بی کے سامنے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ حیران سی بولیں۔

"بیٹی —— تجھے کمانے دھمانے کی کون حاجت ہے۔ مَیں نے تیرے نام اتنی اتنی بھی نہیں ڈیڑھ لاکھ کی جائداد کر دی ہے۔ کچھ نہ کرے اگر صرف بینک میں ہی یہ رقم رکھی رہے تو ہر ماہ ۶-۷ سو آجائیں۔ کیا اتنے میں تیری گزر بسر نہیں ہو سکتی ——"

"نہیں امّی —— امّی —— ایسی کوئی بات نہیں۔" مسرت بے بسی سے بولی۔ "آپ سمجھتی نہیں ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو اور کیا مطلب تھا۔" بڑی بیگم ذرا بناوٹی غصے سے بولیں۔ "کیا تو مجھے ماں نہیں سمجھتی۔"

مسرت نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے "امّی خدا کے لیے یُوں نہ سوچیے۔ مَیں نے کب کہا آپ میری ماں نہیں ہیں۔ وہ بھرائی آواز سے بولی۔" خدا کے بعد تو جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں۔ میرے لیے اور کون ہے ... ..."

آگے اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ وہ رو پڑی۔ اس کے ساتھ بڑی بیگم بھی رو دیں۔ مسرت سچ مچ ان کی جان ایمان بن کر رہ گئی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ پاتیں جبکہ اس کے چہرے پر غم کی ہلکی سی چھاپ بھی انھیں دنوں ملول کر دیتی۔ وہ اس

کے آنسوؤں اور مسکراہٹوں غم اور خوشیوں اس کے اندھیروں اُجالوں کی —— سبھی چیزوں کی وہی ذمہ دار تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی مسرّت کی طرف اُنگلی بھی اُٹھا سکتا اور اسے ایک بول بھی بول سکتا —— بیٹے سے تو اسی مارے مدّت ہوئی بول چال بند ہو چکی تھی جب سے کہ انھوں نے جائداد کا وارث مسرّت کو قرار دیدیا تھا۔ صالحہ بھی بگڑیں بہت۔ مگر قدرتی بات ہے کہ بیٹیاں ماں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں اس لیے وہ ماں سے ٹوٹ تو نہ سکیں ہاں شیشے میں بال ضرور پڑ گیا۔ مگر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی وجہ سے بڑی بیگم بددل ہو کر بیٹے بیٹی کی بات مان جائیں۔ وہ جس مقصد کو لے کر چلی تھیں وہ مقصد —— وہ راہ سیدھی جنّت تک پہنچتی تھی۔

مسرّت خوبصورت تھی جوان تھی تعلیم یافتہ تھی اور وہ پیسے والی بھی۔ جب یہ ساری خوبیاں ایک جگہ جمع ہوں تو پیام یوں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے آندھی پانی سے کچی امیاں پٹاپٹ گرتی ہیں۔ قریبی لوگوں کو معلوم بھی تھا کہ مسرّت بڑی بیگم کی اپنی سگی بیٹی نہیں۔ مگر ڈیڑھ دو لاکھ کی جائداد نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ پیام لانے والوں میں وہ بھی تھے جنھوں نے بڑی بیگم کے اس اقدام پر ناک بھوں چڑھائی تھی کہ اور کچھ نہیں سوجھا تو غلام زادے کی یتیم یسیر لڑکی کو ہی بیٹی بنا ڈالا۔ اور وہ بھی جو اس نیک قدم کو جی جان سے سراہتے تھے اور چاہتے تھے کہ واقعی اس بے مثال ہیرے کی جوت انھیں کے مقدر کی جوت بن جائے۔

بڑی چھان بین کے بعد آخر کار بڑی بیگم نے ایک خاندانی لڑکا پسند کر ہی لیا۔ لڑکا بے حد قابل، بے حد سوجھ بوجھ والا تھا۔ سول انجنیئر تھا۔ گھر کا بھی کھاتا پیتا تھا اور تنخواہ بھی آٹھ سو تھی۔ زیادہ زیورات دولت کی بڑی بیگم کو لالچ تھی نہ خواہش۔ خدا کا دیا ان کی مسرّت کے پاس اتنا کچھ موجود تھا کہ زندگی بھر چاہتی تو چار کو کھلا کر خود کھا سکتی تھی۔ وہ صرف شرافت پر جان دیتی تھیں سو خدا نے ان کی سُن لی۔

جہیز کا جوڑ جماؤ ہونا شروع ہوا تو بس یُوں لگتا تھا کہ گھر میں دو دکانیں کھل گئی ہیں۔ حویلی کتنی بڑی تھی۔ اِس کمرے میں کپڑے سل رہے ہیں۔ اُس کمرے میں جوڑوں پہ گوٹا کناری ٹک رہا ہے۔ اس کمرے میں سُنار بیٹھا ٹھک ٹھک کر رہا ہے۔ اس کمرے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے تو اس کمرے میں تیار زیورات کی جانچ ہو رہی ہے۔

رقعے چھپے اور مقررہ تاریخ پر لوگ آنے شروع ہوئے ان میں جلنے والے بھی تھے اور سچے دل سے خوش ہونے والے بھی۔ مسرت مایوں منجے بیٹھ چکی تھی۔ سُنہرے لباس میں اس کا حُسن اور نکھر آیا تھا۔ جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ بڑی بیگم کا کمرہ اس کے کمرے سے ہی ملحق تھا۔ ملنے جُلنے والیاں آتیں۔ اس کا چہرہ دیکھ جاتیں اور پھر دان جہیز کا نظارہ کرتیں بڑی بیگم کے پاس پہونچ کر گفتگو کا ایک ہی موضوع باقی رہ جاتا۔ "بیگم آپ نے تو واقعی حد کر دی حد۔ کیا دل پایا ہے کہ بس واہ۔" بڑی بیگم مطمئن لہجے میں بڑے انکسار سے کہتیں۔ "میں نے کیا کیا ہے بی بی سب حوصلہ خدا کا دیا ہوا تھا ورنہ مَیں کیا کر سکتی تھی۔ بس خدا نے سُن لی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اور بس۔ پھر میں اللہ اللہ کروں۔ سوائے عاقبت کے اب کوئی فکر نہیں۔"

کہنے والیاں ہاں میں ہاں ملاتیں "اور کیا۔ اب آپ نے اتنا بڑا ایثار کیا ہے تو خدا کے ہاں جنّت تو آپ کی ہی منتظر ہے بس۔"

"ہاں بی بی۔ حضور صلعم نے فرمایا ہے کہ جس نے تین لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کیا اور بیاہ دیا وہ جنّت کا مستحق ہو گیا۔ یہ میرے ہاتھوں گیارہویں لڑکی بیاہی جا رہی ہے۔ صرف جنّت کی اور خدا کی خوشنودی کی آس ہے ورنہ اب دنیا میں اور کیا رہ گیا ہے۔"

بازو کے کمرے میں مسرت بیٹھی سُنتی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے آپی آپ اس کی سِسکیاں اُبھرنے لگیں۔ کون جانے میکہ چھوٹنے پر یہ آنسو بہتے تھے یا اور کوئی غم چُپکے چُپکے اسے کھائے جاتا تھا۔

اگلا دن عقد خوانی کا تھا۔ ایک دن پہلے مہندی ہوئی تھی۔ ہرے ہرے جوڑے

میں مسرت کومل ڈالی کی طرح جھکی جا رہی تھی مہین پلّو میں سے عارض کی تابانی جھلکتی تو کچھ یوں لگتا کہ شاید سورج ابھی ادھر ہی سے طلوع ہوگا۔

مہمان۔ بیبیاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ وہ دھوم دھڑکا تھا کہ کان پھٹ کر رہ جائیں زنانے مردانے دونوں جگہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگوں کا اندازہ تھا کہ دان جہیز کو تو چھوڑو صرف بارات اور مہمانوں کا اوپری خرچ ہی کوئی تیس چالیس ہزار کا پڑ جائے گا۔ کل کا دن تو بڑے ہنگامے کا ہوگا۔ اس خیال سے حویلی میں آج ہی سے جہیز جمانا شروع کر دیا گیا۔ بھر بھر کمرے جہیز سے اَٹے پڑے تھے۔ بڑے وسیع ہال میں جگ مگ کرتی کار۔ ریڈیو سیٹ۔ گراموفون فرج۔ گرام۔ صوفہ سیٹ۔ ڈبل بیڈ کیا کیا نہ تھا۔ بس حویلی کیا تھی دوکانوں کا روپ ہو کر رہ گئی تھی۔

بڑی بیگم مسرت کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں بار بار بھر آتیں اور وہ آنسو پی پی جاتیں۔ کل مسرتِ پرائی ہو جائے گی۔ کتنی مصیبتوں سے پالا۔ کتنی محبت اسے دی سب چیز سے مُنہ موڑ کر سارے بندھن توڑ کر وہ بڑی بیگم کو اکیلی چھوڑ کر چلی جائے گی۔ جھر جھر بہتے آنسوؤں کو اب انھوں نے روکنے کی کوشش کی بھی نہیں ——— اسی دن کے لیے تو وہ آس مند تھیں صرف اس دن کے لیے اِتنی ساری کٹھنائیوں کو وہ شربت جان کر پی گئی تھیں، کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ آخر کو یتیم یسیر تھی۔ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ساری دُنیا مل کر ان کے منہ پر کالک تھوپ گدھے پر بٹھا دیتی۔ کل اس کے وداع ہوتے ہی ان کی نامکمل جنت میں آخری اینٹ بھی رکھ دی جائے گی اور وہ اپنے خدا کے آگے سرخرو ہو سکیں گی۔

بڑی بیگم اپنے خیالات سے جب چونکیں تب ممانی جان نے ان کا شانہ تھپ تھپا کر کہا۔

”مبارک ہو بہن ——— خدا نے تمہاری دیرینہ آرزو پوری کی۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے اس سے زیادہ ایک ماں کی تمنّا اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”ہاں بی بی۔“ بڑی بیگم اور کچھ نہ کہہ سکیں۔ بھر بھر آنے والے آنسوؤں نے ان کا گلا

دبوچ لیا۔ مہمان بیبیوں میں سے کوئی بولیں۔

"مگر بڑی بیگم آپ پر واقعی کمال حیرت ہے۔ آپ نے کس طرح بیس برسوں تک اپنے وجود کو بھلا کر بالکل ایک نوکر بن کر بٹیا کی خدمت کی ہے۔ کبھی دیکھنے والوں کو ایسا لگا ہی نہیں کہ یہ آپ کی سگی بٹیا نہیں۔"

"نہیں نہیں۔" بڑی بیگم تڑپ کر بولیں" ایسا نہ کہیئے ایسا نہ سوچیئے۔ وہ میری سگی بیٹی ہی ہے بلکہ سگی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے اس منزل تک پہنچا کر میں خود بھی تو جنّت کی اہل.....

بات ابھی بڑی بیگم کے مُنہ میں ہی تھی کہ مسرّت کی کانپتی آواز پوری طاقت کے ساتھ کمرے میں اُبھری "مَیں آپ کی بیٹی نہیں ہوں بڑی بیگم —— مَیں آپ کی بیٹی نہیں۔ بیس برسوں سے اس جملے کو سُنتے سُنتے خدا گواہ ہے میرے کان پک گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں مَیں آپ کی بیٹی نہیں صرف وہ راہ ہوں جس پر چل کر آپ جنّت تک جاسکیں گی۔ آپ نے زندگی میں کبھی مجھے ماں کی محبت نہیں دی، کبھی باپ کا پیار نہیں دیا، کبھی مجھے اپنی اولاد نہ جانا۔ جانا تو بس یہ مَیں ایک سہارا ہوں آپ کی جنّت کے حصول کا۔ آپ کی دولت عزّت جائداد، دان دہیز یہ سب فریب ہے دکھاوا ہے۔ مَیں جانتی ہوں کہ اصلیت کیا ہے۔ اصلیت صرف یہ ہے کہ آپ کو جنّت چاہیئے تھی جو آپ نے میرے خون کے بدلے واقعی حاصل کرلی۔"

بڑی بیگم نے گھبرا کر دیکھا —— "مسرّت یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔ کیا ہو گیا ہے تجھے۔ تو ہوش میں ہے یا نہیں —— لوگ کیا سوچیں گے کیا کہیں گے بیٹی۔ ذرا ہوش کی لے۔"

مسرّت پلنگ پر سے اُٹھ کر بھاگی۔

"مَیں ہوش میں ہوں —— پورے ہوش میں۔ بیس برس سے ہوش میں ہی تو ہوں —— لیکن آج مَیں نے اپنے ہر نفس کو بھول جانا چاہتی ہوں —— لیکن ایک دعا کرتی جاؤں گی کہ خدا آپ کو واقعی جنّت دے۔ بیس برسوں تک آپ نے

جس خلوص اور جس محنت سے جنّت کی آرزو کی ہے اگر خدا نے نہ دی تو اس جیسا ناانصاف کوئی نہیں۔"

بڑی بیگم اسے سنبھالنے کو لپکیں مگر وہ سب سے بُلند اور اُونچی ٹیک پر سے نیچے چھلانگ لگا چُکی تھی۔ انھوں نے ہولا کر نیچے جھانکا۔ جیتے جیتے سُرخ سُرخ خون کی ندی سی بہہ نکلی تھی۔ ان کو قطعاً سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ندی جنّت کو جا رہی ہے یا دوزخ کو ——

شرون کُمار

دِل دریا

میں کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔

لوٹ کر دھرم شالہ جانے کو بھی من نہیں چاہتا۔ ایک عجیب سا دُکھ عجیب سی اُداسی سارے وجود پر چھا گئی ہے۔ ایسا گہرا اور لمحہ بہ لمحہ پھیلتا ہوا دکھ جو کچھ کرنے نہیں دیتا۔ شاید یہی وہ دکھ تھا جس نے گوتم کو گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ دریا پر رات اُتر آئی ہے اور گھاٹ کی روشنیاں مند مند بہتے پانی پر جھلملا رہی ہیں۔ مندروں میں شام کی آرتی کے بعد خاموشی چھا گئی ہے۔ ایسی خاموشی جو مقدس بھی ہے اور پُراسرار بھی —— بالکل خدا کے وجود کی طرح —— دریا کے پار سادھووں کی ایک ٹولی الاؤ جلائے بیٹھی ہے۔ فضا میں کبیر کے دوہے کی سی نرم گمبھیرتا اور اُداسی ہے اور میں گنگا کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ سادھو ہو جاؤں۔ یہی مُکتی کی راہ ہے۔

میں بیٹھ گیا۔ ہر کی پوڑی ٹھنڈی ہے اور یہی بے جان سی ٹھنڈک فضا میں بھی ہے بالکل ہمارے گھر کی طرح۔ گھاٹ سنسان ہے۔ مجھے غور سے دیکھنے والا جٹا دھاری سادھو کھڑاویں بجاتا ہوا پُل پار کر چکا ہے اور وہ گھی کے چراغ میں نے پاروتی کی آتما کی راہ میں روشنی کرنے کے لیے ان پوتر لہروں پر بہلائے تھے ڈولتے ہوئے دُور چلے گئے ہیں۔ اُدھر جہاں سمندر ہے وسیع و عمیق۔

اور وہ ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی زرد بتّی بالکل اکیلی اکیلی سی لگ رہی ہے اور یوں چُپ چاپ اُداسی سے سب کچھ دیکھ رہی ہے جیسے پاروتی اپنی کھڑکی کی سلاخیں تھامے کھڑی بچّوں کو کھیلتے دیکھا کرتی تھی۔

پاروتی ہماری کوئی نہیں تھی۔ پڑوسن بھی نہیں۔ کبھی وہ ہمارے مکان کے ایک حصّے میں کرایہ دار تھی اور اپنی بیوہ پھوپھی کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب مَیں ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ پتاجی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور ماں اس گھر میں نہیں آئی تھی (یہ سب باتیں مجھے گاہے بگاہے دیدی سے معلوم ہوتی رہی ہیں جس نے یہ سب کچھ ماں اور دادی سے سُنا تھا)۔ پاروتی کے ماں باپ نہیں تھے اور اس کی پرورش اس کی بیوہ پھوپھی نے کی تھی۔ دادی نے ایک دن اس کا سامان اُٹھوا کر گلی میں رکھوا دیا کہ اسے جگہ کی ضرورت ہے۔ پتاجی کی شادی جو تھی ــــــ ماں کو دادی اس کی پیدائش سے پہلے ہی پیار کرنے لگی تھی۔ یعنی جب وہ ہماری نانی کے پیٹ میں ہی تھی تو دادی نے اسے اپنی بہو بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ دُنیا میں آنے سے پہلے ہی اس گھر میں آگئی تھی۔ دادی پٹواری کی بیٹی اور تھانیدار کی بیوی تھی۔ اس لیے ہمیشہ حکومت کرتی رہی۔ کہتے ہیں کہ ان کے آگے چڑیا بھی پَر نہیں مارتی تھی۔ دادی میری پیدائش سے پہلے ہی آسمانوں میں چلی گئی۔ جہاں جنّت میں خدا اور جہنّم میں شیطان کی حکومت ہے نہ جانے وہ وہاں کیا کرتی ہوگی۔ شاید چڑیوں کو اُڑتے دیکھتی ہو۔ پاروتی اور اس کی پھوپھی ہمارے مکان سے نکل کر اس مکان میں رہنے لگیں جس میں آخر تک پاروتی رہی۔ اس کی پھوپھی غریب تھی اور بوڑھی بھی۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ پاروتی کی شادی ہو جائے لیکن پاروتی ہمیشہ انکار کرتی رہی اور جب پھوپھی بھی مر گئی تو کہنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔

پاروتی میری کوئی نہیں تھی پھر بھی اپنی بہت زیادہ اپنی لگتی۔ ایسی جو دل میں، رُوح میں اپنی ہوتی ہے اور ذہن پر چھائی رہتی ہے اور ہم ہر جگہ ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ کھڑکی اُس کھولے میں کھُلتی ہے جہاں گلی کے بچّے کھیلا کرتے تھے۔ اور شور مچاتے تھے اور

آپس میں لڑتے تھے۔ پھر فوراً من جاتے تھے۔ سکول کی طویل قید اور گھر کی پابندیوں کے بعد یہ اچھا لگتا تھا۔ میں بھی اسکول سے وہیں آجاتا۔ نہ جانے کیوں پاروتی کے مکان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہونا دل کو بھاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دیوار کے پیچھے اس مشین کی آواز ہوتی تھی جس پر پاروتی محلے والوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ جب وہ کھڑکی میں آئی تو ہم سمجھ جاتے کہ اسے سوئی بٹن یا دھاگے کی ضرورت ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مجھے ڈر لگتا کہ کہیں وہ مجھ سے نہ کہہ دے — کیا میں انکار کر سکوں گا کہ میں چاہتا بھی تو تھا کہ وہ اپنے سب کام مجھ سے کرائے۔ اس کی شخصیت ہی اس قدر پُرکشش تھی۔ اس کی آواز اتنی میٹھی تھی — اور کیا میری ٹانگیں مجھے گلی کے باہر اس دکان تک لے جائیں گی جہاں یہ سب کچھ ملتا تھا۔ ماں کی سخت ہدایت تھی کہ اس سے بات بھی نہ کرو۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں کہتی تھی۔ اس کی نظریں ایک پل کے لیے میرے چہرے پر ٹھہرتیں۔ وہ مسکراتی جیسے میرے خیالات پڑھ رہی ہو۔ بڑے ہونے کے کتنے فائدے ہیں۔ وہ کسی اور کو بلا کر چیز منگا لیتی۔ میرا دل اس کوئلے کی طرح بجھ جاتا جس پر پانی ڈال دیا گیا ہو اور پھر میں سارے "کنچے" ہار جاتا۔ مجھے ہارنا ہی اچھا لگتا۔

"پاروتی مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی —" میں دیدی کو بتاتا۔

"شی۔ ماں سُن لے گی۔" دیدی کہتی۔

"ماں ہمیں اس سے بات کرنے سے کیوں منع کرتی ہے۔"

"وہ ہماری دُشمن ہے۔"

ماں کہتی تھی پاروتی اچھی عورت نہیں ہے ورنہ اس سے کوئی شادی نہ کر لیتا۔

اور یہ کہ وہ جادو ٹونا کرتی ہے۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ جادو ٹونا کرنے والی عورتیں آدمی لو بھیڑیا کتا بنا کر قید کر لیتی ہیں اور وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ میں کنچے کھیلتا ہوا اسے غور سے دیکھتا تو وہ مجھے جادوگرنی بالکل نہ لگتی۔ اس کا چہرہ گول اور خوبصورت تھا۔ اور آنکھیں بڑی بڑی اور کالی۔ وہ بال ہمیشہ کھلے رکھتی تھی جس سے کبھی کبھی مجھے ڈر سا لگنے

لگتا۔ میں جب سے اسے دیکھتا تو مجھے ماں کے پوجا کے کمرے میں رکھی چاندی کی لکشمی یاد آنے لگتی۔ اور لکشمی کی تو ماں پوجا کرتی تھی پھول چڑھاتی تھی اور آرتی اُتارتی تھی لیکن پاروتی کو گالیاں دیتی تھی اور کوستی تھی۔ میں پتاجی سے پوچھتا کہ ماں ایسا کیوں کرتی ہے تو وہ یوں میری طرف دیکھتے جیسے میرے آر پار دیکھ رہے ہوں۔ مجھے ان کا اس طرح دیکھنا ہمیشہ عجیب سا لگتا ہے۔ اور اس سے خوف بھی آیا ہے کہ ہم خود کو ان نظروں کے سامنے محفوظ محسوس نہیں کرتے اور کوئی راز راز نہیں رہتا۔ اور جب ہمارا راز راز نہ رہے تو زندگی کیا ہوئی۔ ہمارے وجود کے معنی کیا ہوئے۔ شخصیت میں تھوڑا سا اسرار تو ضرور ہونا چاہیئے۔ اس طرح آدمی Important بنا رہتا ہے۔ وہ مجھے جب بھی اس طرح دیکھتے تو میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگتا اور مجھے خود پر غصہ آنے لگتا کہ میں انھیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صرف ان کا چہرہ ناک کان ہاتھ پاؤں دیکھ سکتا تھا۔ ماں نے بچپن میں بتایا تھا کہ یہی تمھارا باپ ہے (سب مائیں شاید یہی بتاتی ہیں معصوم بچوں کو دھوکا دیتی ہیں) لیکن دراصل وہ باپ نہیں ہوتا جسے ہم دیکھتے ہیں۔ باپ تو اس کے اندر بہت گہرائی میں کہیں چھپا ہوتا ہے جسے ہم میں سے بہت کبھی دیکھ نہیں پاتے اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہی سچائی ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

”پاروتی جادوگرنی ہے۔“ میں پوچھتا۔

”جادو کوئی چیز نہیں۔“

”تو پھر ماں کیوں کہتی ہے۔“

”آدمی کو وہی بات ماننی چاہیئے جس کا اُسے یقین ہو۔“

”اسے بھی کسی کام کا نہ چھوڑنا۔“ ماں ایسے موقعوں پر نہ جانے کہاں سے آ ٹپکتی۔ جب پتاجی کی باتیں اچھی لگنے لگتیں اور دل ان کے پاس بیٹھنے کو چاہتا تو وہ چلی آتی۔

”چل پڑھ جا کر۔“

پتاجی خاموش ہو جاتے۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا کہ وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی

وہاں نہیں ہیں۔ میں اُٹھ کر آجاتا۔ ماں بعد میں بھی بولتی رہتی لیکن پتاجی کی آواز سُنائی نہ دیتی۔ وہ ماں کی باتوں میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے جو کہتی خاموشی سے مان لیتے اور گھر میں بے تعلق سے رہتے۔ تب بھی ماں ان سے ناراض سی رہتی۔ پتاجی سے بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں لوہے کی گولیوں کی طرح سَرد رہتیں۔ پیشانی پر بل ہوتے اور لہجے میں تلخی ہوتی۔ اس کی آواز دیر تک سُنائی دیتی رہتی۔ کچن میں آنگن میں کمرے میں —— اور ہم سب بھائی بہن سہمے سے کونوں میں دُبکتے رہتے۔ پتاجی کے حقے کی گڑگڑ اور بھی تیز ہو جاتی اور دھواں جلدی جلدی ان کے مُنہ سے نکلنے لگتا۔ اور سَر جُھکائے اپنی مخصوص آرام کرسی پر خاموش بیٹھے رہتے۔ میں سوچتا کہ وہ گوگی یا ڈالی کے ڈیڈی کی طرح کڑکتے گرجتے کیوں نہیں۔ کبھی کبھی ماں کو ڈانٹ کیوں نہیں دیا کرتے —— بس ماں کی ان لوہے کی گولیوں جیسی سرد نظروں سے بچنے کے لیے پوجا کے کمرے میں چلا جاتا جہاں چاندی کی لکشمی پھولوں میں ڈھکی ہوتی اور فضا میں صندل اور لوبان کی خوشبو ہوتی ماں دیر تک مورتی کے سامنے جُھکی رہتی۔ پتاجی اس کمرے میں کبھی نہیں گئے تھے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ دھرم کرم اور آتما پرماتما کی باتیں کرتے۔ ان کی باتیں دلچسپ تو لگتیں لیکن تب سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مورتی کے سامنے کھڑا میں سوچا کرتا —— ماں جب دھرم کرم مانتی ہے پوجا پاٹھ کرتی ہے تو پتاجی سے کیوں لڑتی ہے اور وہ اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہے اور ہمیں پیار کیوں نہیں کرتی۔ کبھی ہمارا مُنہ کیوں نہیں چومتی چھاتی سے کیوں نہیں لگاتی۔ اگر دودھ پینے کو دیتی ہے تو ڈانٹ کر۔ کھانا دیتی ہے تو گھور کر۔ ڈالی کی ماں کتنے پیار کتنی نرمی اور محبّت سے بات کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں ربن ڈالتی ہے اور اسے دروازے تک چھوڑنے آتی ہے اور مسکرا کر ٹاٹا کہتی ہے۔ ماں نے کبھی ہمارا ہاتھ مُنہ نہیں دُھلایا ہم پر اُٹھ اُٹھ کر رات کو کبھی رضائیاں نہیں ڈالیں۔ ہمیں کبھی کہانیاں نہیں سُنائیں۔ وہ لوری گا سکتی ہے کہ نہیں ہمیں معلوم نہیں۔ وہ جھڑک سکتی ہے۔ گالیاں دے سکتی ہے۔

پیٹ سکتی ہے۔ مرو جاکر میری جان کیوں کھا رہے ہو۔ اپنے باپ سے کہو جاکر ـــــ یہ سب مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے باوجود وہ ہماری ماں ہے۔ اس نے ہمیں جنم دیا ہے۔

اس شام بھی جب وہ پتاجی کے کمرے سے بڑبڑاتی نکلی تو اس کی پیشانی پر بل تھے اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ میں چپکے سے پوجا کے کمرے میں چلا گیا۔ اور وہاں ایک کونے میں دبکا اس چوہیا کو دیکھ رہا تھا جو چوکی کے پیچھے سے نکلی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بتاشوں پر جھپٹی اور تھوڑا سا کتر کر بھاگ گئی۔ چیونٹیوں کی ایک قطار بتاشوں سے دیوار تک چل رہی تھی۔ کبھی کبھی دو چیونٹیاں ایک دوسری کے سامنے آجاتیں تو ایک سانحہ کے لیے رُکتیں۔ شاید آپس میں باتیں کرتیں ـــــ ہیلو کیا حال ہے۔ کدھر چلیں۔ اور پھر اپنی اپنی راہ لیتیں۔ مجھے اس کونے میں بڑا سکون ملتا۔ گھر کی بوجھل اور موت کی سی خاموش فضا سے وہ کونا کہیں اچھا تھا۔ میں دیوار سے لگا بیٹھا چوہیا اور چیونٹیوں کا تماشہ دیکھتا رہا کہ ماں آگئی۔ آتے ہی اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جب وہ پلٹی تو مجھے دیکھ سکی۔ لپک کر اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔

"بتاشے چرانے گیا تھا"

بہت پہلے کبھی مَیں نے یہ حرکت کی تھی اور ماں سے چانٹا کھا کر اور یہ سُن کر کہ یہ پاپ ہے پھر کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن ماں ـــــ وہ ہمیشہ ہی شک کرتی ہے۔ اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں۔ اور وہ بات کہنے سے پیشتر کبھی نہیں سوچتی اور پھر کبھی پشیمان بھی نہیں ہوتی چوری کا الزام لگا کر وہ مجھے گھور رہی ہے۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ جواب دینا فضول ہے۔ وہ اعتبار تو کرے گی نہیں۔ مَیں خاموش رہا۔

"تم سب نرک میں جاؤ گے۔ سب کے سب پاپی ہو۔"

اس پل پتاجی چھڑی سنبھالے کمرے سے نکلے تھے۔ ماں کی بات سُن کر ایک لمحہ کے لیے رُکے۔

"جاؤ سیر کا حرج ہوگا۔" ماں کے لہجہ میں زہر تھا۔ کبھی سوچا ہے کہ کوئی گھر بھی ہے۔ بچّے چوری کرنا سیکھ رہے ہیں۔"

"مَیں نے کچھ نہیں چُرایا۔" مَیں نے پتاجی کو بتایا۔

فیصلہ دینے والا بھگوان ہے ہم نہیں —— وہ سب کچھ جانتا ہے۔

"اُونہہ" ماں نے ہونٹ بچکا کر نفرت اور غصّے کا اظہار کیا۔ دیکھ لینا وہ دُردشا ہوگی سب کی کہ یاد کروگے۔ سات جنم دکھ بھوگوگے۔" اور پھر مجھ سے 'جامر پڑھ جاکر' کیوں سب میری جان کے دُشمن ہو رہے ہو۔"

اس لمحہ مَیں نے ماں کے لیے سخت نفرت محسوس کی۔ کچھ دیر ماں بڑبڑاتی رہی۔ پھر گھر پر خاموشی طاری ہوگئی۔ مَیں کتاب لے کر دیدی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ نٹنگ کر رہی تھی۔ میرا جی پڑھائی میں نہ تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ پتاجی کہاں گئے ہوں گے۔ ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ فلم دیکھنے کا شوق انھیں نہیں تھا۔ کوئی ہابی بھی نہیں تھی پھر وہ آخر کرتے کیا ہیں۔ رات کو دیر سے لوٹتے ہیں۔ تب ماں جاکر دروازہ کھولتی ہے اور وہی سالوں پُرانا جملہ سُنائی دیتا ہے —— "ہوگئی سیر ختم ——" اور وہ پتاجی کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آجاتی ہے اس وقت سب سوگئے ہوتے ہیں۔ مَیں جاگتا رہتا ہوں۔ کئی مرتبہ مَیں نے سوچا کہ جاکر دروازہ کھولوں لیکن ہمت نہیں ہوتی۔

اس شام مَیں کنچے جیب میں بھر کر کھولے میں گیا تھا۔ کنچوں سے زیادہ مجھے پاروتی میں دلچسپی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ماں ہر وقت اسے بُرا کیوں کہتی ہے اور کہ وہ کیسے جادو کرتی ہے۔ کھیلتے کھیلتے میرے پاؤں میں کانچ کا ایک ٹکڑا چُبھ گیا اور خون بہنے لگا۔ مَیں ماں کے ڈر سے رو بھی نہ سکا کہ وہ ایسے موقعوں پر ہاتھ سے بات کرتی ہے۔ تمام بچّے میرے گرد جمع ہوگئے۔ شاید کسی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ خون کو کیسے روکا جائے۔ اس وقت کھڑکی میں پاروتی دکھائی دی۔

"کیا ہوا۔" اس نے پُوچھا۔

"پپّو کو چوٹ لگی ہے۔ بہت خون نکلا ہے۔"

چند سیکنڈ بعد وہ میرا پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ پھر وہ مجھے سہارا دے کر اپنے مکان میں لے گئی۔ رُوئی سپرٹ میں تر کر کے میرا زخم صاف کیا۔ سپرٹ نے زخم میں مرچیں سی لگا دیں۔ میں چلایا تو وہ جُھک کر پھونک مارنے لگی۔

"مرد ہو کر اتنی سی چوٹ سے گھبراتا ہے۔" وہ ہنسی۔ "چل کھڑا ہو جا کچھ نہیں ہوا ایسی چوٹیں تو روز لگتی ہیں۔"

یہ لہجہ یہ ہمدردی یہ اپنا پن میرے لیے بالکل نیا تھا۔ ماں ہوتی تو چانٹا مار کر پوچھتی۔ آنکھیں بند تھیں۔ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر لیا کرو۔" اور پھر وہ ڈیڈی سے کہتی "اری پٹی باندھ دے اس کے ——" مَیں حیرت اور شوق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس سانپ کی طرح جو نہ ہوتے ہوئے بھی اندھیرے میں محسوس ہوتا رہتا ہے۔

"کیا دیکھ رہا ہے رے۔" وہ مُسکرائی۔

"تم جادو سے مجھے بٹیر بنا دو گی ——" مَیں نے ایک دَم کہہ دیا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "اچھا یہ کس نے کہا تجھ سے۔"

مَیں چُپ رہا۔ اور ایک دم مجھے ماں سے نفرت کا احساس ہوا اور نہ جانے کیوں مَیں نے سوچا کہ ماں سے انتقام لینے کا یہی بہترین موقعہ ہے۔ میں نے دبے لہجے میں کہا "ماں کہتی ہے۔"

پاروتی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ پھر ہنسنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ماں سے نفرت کا اظہار کرے گی اسے گالیاں دے گی اور اس طرح میرے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو جائے گی۔ لیکن میرے اس جذبہ پر اس نے ہنس کر اوس ڈال دی۔ مَیں نے پوچھا۔

"جادو کیسے کرتے ہیں۔"

" جادو کوئی چیز نہیں ہے۔ آدمی کو جادو سے نہیں محبت اور پیار سے جیتا جاتا ہے اور جو محبت کر سکتے ہیں۔ بھگوان ان سے خوش ہوتا ہے۔"

" پتاجی بھی یہی کہتے ہیں۔"

پاروتی نے میری طرف دیکھا اور سپرٹ کی شیشی اُٹھا کر الماری میں رکھنے چلی گئی۔ اس وقت باہر ماں کی آواز سُنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ شاید کسی نے ماں کو خبر کر دی تھی میں سہم گیا۔ پاروتی میرے قریب آئی۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے بولی۔ " تمہاری ماتاجی ہیں۔"

میں نے خوفزدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سَر ہلا دیا۔ اس پَل تو میں نے سوچا کہ پاروتی مجھے جادو سے بیٹر ہی بنا دے۔ اور ماں دیکھ کر چلی جائے۔

جو ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ دُکھی رہتے ہیں۔ تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ وہ بولی۔ " آؤ" اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔

ماں نے مجھے گھُور کر دیکھا اور یوں میرا ہاتھ جھپٹ لیا۔ جیسے میں اُڑا جا رہا تھا۔

"اسے کانچ چُبھ گیا ہے۔ میں نے زخم دھو دیا ہے۔ گھر جا کر ٹنکچر لگا دیجئے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

" مجھے پتہ ہے۔" ماں نے تلخی سے کہا اور مجھے گھسیٹتی ہوئی گھر لے گئی۔ اوپر پہنچ کر اس نے مجھے پتاجی کے سامنے کھڑا کر دیا اور غصے سے بولی۔

دیکھی اپنے لاڈلے کی کرتُوت۔ پُوچھو اس سے کہاں گیا تھا۔"

پتاجی نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور سَر جھکا لیا۔

میری تو اس گھر میں کوئی سُنتا ہی نہیں۔ جو میں کہتی ہوں وہ ہوتا نہیں۔ پھر وہ مجھے جھنجوڑ کر بولی۔

" بول کہاں گیا تھا۔"

"کھیلنے۔"

"کھیلنے کے بچے۔ مَیں پوچھتی ہوں تو اس کلموہی کے گھر کیا کرنے گیا تھا۔"

وہ خود ہی لے گئی تھی" مَیں نے ڈر کے مارے کہہ دیا۔

"دیکھ لیا۔" ماں نے پتاجی کی طرف دیکھا۔ "میں کہے دیتی ہوں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ لے گئی رانڈ مرہم پٹی کرنے۔ ماں سے سگی پھپھے کٹنی۔ کنجری کوئی جادو ٹونا کرے گی میرے بچے پر۔ اپنا کوئی آگے پیچھے ہے نہیں۔ دوسروں کے دیکھ نہیں سکتی۔ میری تو چنڈال جنم جنم کی بیرن ہے۔ نہ جانے میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ ہے بھگوان مرتی بھی نہیں۔ ہٹی کٹی پھر رہی ہے اِسے آئے کسی کی آئی۔"

پتاجی سر لٹکائے خاموش بیٹھے رہے۔ ان کا ہاتھ کرسی کے بازو پر پڑا کپکپا رہا تھا۔ ٹانگیں لرز رہی تھیں اور نچلا ہونٹ انھوں نے زور سے دانتوں تلے دبا لیا تھا۔ ماں کا غصہ ایک دم اور تیز ہوگیا۔ اس نے زور سے میری پیٹھ پر دوہتڑ جمایا۔ اور لات مار کر بولی۔

اب وہاں گیا تو ٹانگیں توڑ دوں گی" سمجھے" اور وہ مجھے گھسیٹ کر باہر لے گئی۔ "آج تجھے کھانا نہیں ملے گا۔"

اس رات بھی پتاجی دیر سے لوٹے جب ماں تھک کر اپنے بستر پہ پڑ گئی تو وہ میرے پاس آئے۔ بھوک کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پتاجی ایک منٹ تک کھڑے اندھیرے میں مجھے دیکھتے رہے۔ پھر اُنھوں نے میرے سرہانے ایک پیکٹ رکھ دیا۔ اور چلے گئے۔ مَیں نے اندھیرے میں ٹٹول کر پیکٹ کھولا تو اس میں سنڈوچز پیسٹریاں اور بن (BUN) تھے۔ مَیں ایک منٹ تک ہاتھ سے وہ چیزیں محسوس کرتا لیٹا رہا۔ پھر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور مَیں نے محسوس کیا کہ میں پتاجی سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ مَیں اس شخص کے اندر دیکھ رہا ہوں جو میرے سامنے بھی نہیں۔ میں اندھیرے میں لیٹے لیٹے کھاتا رہا اور سو گیا۔

صبح اس پیکٹ کی وجہ سے ماں اور پتاجی میں لڑائی ہوئی پتاجی نے صرف اتنا کہا کہ وہ

بچّوں کو بھوکا نہیں رکھ سکتے۔ ماں اور بھی بھڑک اُٹھی اور جو جی میں آیا کہے چلی گئی پتاجی حسبِ معمول خاموش رہے۔

”تم چاہتے ہو کہ گھر میں میری کوئی عزّت نہ رہے۔ میرے بچّوں کو میرے خلاف اُکساتے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ جو مَیں کہتی ہوں تم اس کے خلاف ہو جاتے ہو۔ چلی جاؤں گھر چھوڑ کر۔ پر یاد رکھو۔ اتنی آسانی سے میں بھی نہیں جانے والی۔“

اور پھر وہی رونا دھونا ٹھنڈا چولہا اور موت کی سی سرد اور زرد فضا۔

اس روز پتاجی مجھے اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُنھوں نے اپنے ساتھ کسی بچے کو لیا تھا۔ ورنہ ہم میں سے کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ باپ کی اُنگلی پکڑ کر بازاروں میں سے گزرنا کھلونوں اور مٹھائیوں کے لیے ضد کرنا کیا ہوتا ہے۔ اس دن مجھے ایک طرح کی حفاظت اور بڑے پن کا احساس ہوا اور ان تمام چیزوں اور مناظر کے معنی ہی بدل گئے تھے جو میں نے سکول سے آتے جاتے اکیلے تھے۔ اب ان میں وہ اکیلا پن نہیں تھا جو دل کو اذیت پہنچاتا تھا۔ ہم مندر میں جا بیٹھے میں تالاب میں مچھلیوں کو دیکھ رہا تھا اور پتاجی کی آنکھیں مندر کے کلس پر چمچماتی دھوپ پر تھیں۔ میرا دل مچھلیوں کے ساتھ تیرتے اور پانی میں غوطا لگانے کو کر رہا تھا۔ لوگ مندر میں آجا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پھول اور پرشاد تھا۔

”تم پاروتی کے ہاں کیوں گئے تھے۔“ اچانک اُنھوں نے پُوچھا۔

ایک مچھلی سطح پر تیرتے پھول کو سونگھ کر پانی میں غوطہ لگا گئی تھی۔

”پتاجی۔ پاروتی بڑی عورت ہے۔“

”وہ دیکھو پھول۔ کوئی تم سے پوچھے کہ یہ کیا ہے تو تم فوراً کہہ سکتے ہو کہ یہ پھول ہے۔ لیکن تم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ پانی کے اندر تالاب کی تہ میں کیا ہے اور سمندر کی تہ میں کیا ہے۔ یہ تو تم بالکل نہیں بتا سکو گے کیونکہ تم نے وہاں پہنچ کر دیکھا ہی نہیں۔ اور جو سُن کر

سیکھتے ہیں وہ پوری طرح نہیں سیکھتے اور جو خود تلاش کرتے ہیں اور گہرائی میں ڈوب کر پتہ لگاتے ہیں وہی پوری طرح سیکھتے ہیں۔ اور سمجھ پاتے ہیں۔

مجھے اس وقت پتاجی کی بات سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن دلچسپ معلوم ہوئی تھی ان کی بھاری گمبھیر آواز دل تک پہنچ رہی تھی اور اس دھوپ کی طرح اچھی اچھی لگ رہی تھی جو سردیوں میں سرسوں کے کھیتوں پر چمکتی ہے۔ اور بدن کو میٹھی میٹھی حرارت بخشتی ہے۔ پتاجی اس شیشے کی طرح لگ رہے تھے جس کے آرپار دیکھا جا سکتا ہے اور اس شخص سے بالکل مختلف تھے جو آرام کرسی میں نیم دراز حقہ پیتے تھے اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے

”تم مندر میں جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔“ پتاجی نے کہا۔

میں مندر کے اندر جہاں مورتیاں تھیں چلا گیا۔ بڑی بڑی سونے چاندی اور پھولوں سے ڈھکی مورتیوں اور چاندی کی چھت اور دروازوں والے کمرے اور سونے کی طرح چمکتے ستون دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ مَیں نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں موند لیں اور پرارتھنا کی کہ ماں پتاجی سے لڑنا بند کر دے اور پاروتی کو بُرا بھلا نہ کہے (جو منظور نہیں ہوئی) پرارتھنا کر کے میں باہر آگیا۔ پتاجی تالاب میں مچھلیوں کو آٹا ڈال رہے تھے۔ جو بھاری تعداد میں پانی کی سطح پر آگئی تھیں۔

”چلیں۔“ انھوں نے پوچھا۔

ہم مندر کی حدود سے نکل آئے۔ کچھ بچّوں کو کھلونے اور مٹھائی لیتے دیکھ کر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کچھ لینا پسند کروگے۔ مَیں نے انکار کر دیا۔ پھر مَیں نے اپنی پرارتھنا کے بارے میں بتایا تو وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ہاں ماں کے لیے دُعا کیا کرو۔“

”پتاجی، ماں آپ سے لڑتی کیوں ہے۔“

” اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔“

” پھر کس کا قصور ہے۔“

” شاید کسی کا بھی نہیں۔“

” پتاجی میری کتاب میں لکھا ہے۔ کسی کو برا مت کہو۔ کسی کا دل مت دکھاؤ۔ کسی سے لڑو نہیں۔ اور سب سے محبت کرو۔“

” ہاں کتابوں میں یہی لکھا ہوتا ہے۔“

پھر انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا۔ پتاجی کے چہرے پر وہی غم وہی بیزاری اور وہی اداسی کی سیاہ پرچھائیاں تیر رہی ہیں اور وہی پتھریلا پن سارے جسم پر چھا گیا ہے اور وہ ایک دم اجنبی غیر اور دور ہو گئے ہیں۔

پاروتی کئی دن کھڑکی میں دکھائی نہیں دی۔ مشین کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ پھر ایک شام گوگی سے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ اور اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش بیدار ہوئی۔ لیکن ماں کا ڈر تھا۔ وہ ٹانگیں توڑ دے گی۔ میں نے ایک شام پتاجی کے ساتھ سیر کرتے ہوئے کہا۔

” پتاجی پاروتی کو بخار آ رہا ہے۔“

وہ دور افق پر پھیلی درختوں کی سیاہ قوس کو دیکھ رہے تھے۔ میری بات سن کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے ان کی انگلیوں میں لرزہ محسوس کیا اور ان کے چہرے پر جیسے سب کچھ پگھل رہا تھا۔ وہ پھر درختوں کی اس قوس کو دیکھنے لگے۔ میں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ واپسی پر ہم مندر گئے۔ پتاجی نے باہر سے آٹا لیا اور گولیاں بنا کر مچھلیوں کو ڈالنے لگے اور میں اندر چلا گیا۔ جب میں باہر آیا تو پتاجی مندر کے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ بولے نہیں۔

” میں نے بھگوان سے کہا ہے کہ وہ پاروتی کو جلدی سے اچھا کر دے۔“

پتاجی خاموش رہے صرف ان کے ہاتھوں کا دباؤ میرے شانے پر قدرے بڑھ گیا اور جیسے وہ پگھل پگھل کر میرے وجود میں سرایت کر رہے تھے۔ مَیں نے پوچھا۔

”پتاجی۔ آپ مندر میں کیوں نہیں جاتے۔“

”بڑا ہو کر آدمی سچا نہیں رہتا۔ اسے ڈر لگنے لگتا ہے۔“

”بھگوان سے۔“

”نہیں اپنی کمزوریوں اور پاپوں سے کہ وہ جو دکھائی نہیں دیتا دیکھتا ہے۔“

پاپ کیا ہوتا ہے پتاجی۔ ماں کہتی ہے بتاشے اٹھا کر کھانے سے پاپ لگتا ہے اور آدمی نرک میں جاتا ہے۔“

”پاپ وہ ہے جو تم ٹھیک سمجھتے ہوئے بھی نہ کرو۔ اور جن میں صحیح قدم اُٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ پاپی ہوتے ہیں اور اس دُنیا میں نرک بھوگتے ہیں اور دکھی رہتے ہیں۔

دوسرے دن شام کو میں پاروتی کے ہاں چلا گیا۔ ماں کی ناراضی کا ڈر ایک لمحہ کے لیے سانپ کی طرح پھنکارا تھا۔ لیکن میں نے اس کا سَر کچل دیا۔ پاروتی کے کمرے میں زرد اور مدھم روشنی والی لالٹین جل رہی تھی جس سے کمرے کی اُداسی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پاروتی دیوار کے ساتھ چارپائی پر کمبل لپیٹے پڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد۔ ہونٹ خشک اور بال بکھرے سے تھے۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر پُکارا۔

”پپّو۔“

مَیں اس کے قریب چلا گیا اور بستر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا پاروتی نے کمبل سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنے بستر پر بٹھا لیا۔ اس لمحہ مجھے ایسا لگا کہ میں پاروتی کے وجود کا ایک حصّہ ہوں اور وہ بے چینی جو میرے دل میں تھی۔ اس کے چھو دینے سے ایک دم دُور ہو گئی۔

”کل مَیں نے مندر میں پرارتھنا کی تھی کہ تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔“

"کیوں۔"

مجھے خود نہیں معلوم کہ مَیں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا اور اس کی نرم اُنگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کرتا رہا۔ اس نے شاید اپنی آنکھیں پونچھی تھیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"تمھاری ماتاجی کو معلوم ہو گیا تو۔"

"تمھیں معلوم ہو گا پتاجی ماں سے کبھی نہیں کہیں گے۔ ماں ان سے لڑتی ہے۔ پہلے پتاجی کسی کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ اب صرف مجھے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اور بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ پہلے مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ اب نہیں لگتا۔ وہ باہر جا کر باتیں کرتے ہیں گھر میں بالکل نہیں بولتے۔

"کیا باتیں کرتے ہیں۔"

مجھے پوری طرح ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور جو سمجھ سکا اسے بیان کرنے کے لیے شاید میرے پاس الفاظ نہیں۔ اس لیے میں پھر خاموش ہو گیا۔ چند سیکنڈ کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر مَیں نے کہا۔

"ماں کہتی ہے تم بہت بُری ہو اور ہماری دُشمن بھی۔"

وہ چھت کو دیکھتی ہوئی ہنس دی۔ پھر بولی۔

"پھر یہاں تم کیوں آئے ہو۔"

"مجھے تم اچھی لگتی ہو۔"

پاروتی نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر اس نے وہی بات کی جو پتاجی نے کہی تھی اور میں حیران تھا کہ دونوں نے ایک ہی طرح کیسے سوچا۔

"تم نے میرے لیے پرارتھنا کی ہے نا۔ ماں کے لیے پھر کرنا۔"

پھر وہ میرے سکول اور پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگی اور یہ کہ مَیں پڑھ کر کیا

بنوں گا اور کیسے رہوں گا۔ اتنی دلچسپی سے نہ ماں نے کبھی پوچھا تھا اور نہ پتاجی نے نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ مستقبل میں مجھے کیا کرنا ہے۔

اس روز پاروتی کی دوا لینے بھی میں گیا۔ واپسی پر ماں نے دیکھ لیا۔ اس نے پوچھا بھی دوا کس کی ہے۔ لیکن میں جواب دئے بغیر بھاگ آیا اور دوا پاروتی کو دے کر گھر چلا گیا۔ ماں اس وقت پتاجی کے سامنے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور تھانیداروں کی طرح بول رہی تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ پاروتی کا اور میرا نام بھی لیا تھا۔ اس لیے مَیں سمجھ گیا تھا کہ میرا ہی ذکر چل رہا ہے۔ میں چُپ چاپ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا کہ ماں نے دیکھ لیا اور لپک کر مجھے گردن سے دبوچ لیا۔

”جا کہاں رہا ہے۔ ادھر آ۔“ اور مجھے گھسیٹ کر پتاجی کے سامنے لے آئی۔

”جان سے مار دے اسے۔ مجھے کیا کہتی ہے۔ میں کیا کروں۔“ پتاجی نے نہایت لاتعلّق سے کہا۔

”جان سے تو تم مجھے مار دو گے۔“ ماں پھنکاری۔ ”اسے اور سر چڑھاؤ اور ساتھ لیے لیے پھرو۔ خوب میرے خلاف سکھاؤ۔ تمھیں چین ہی اس دن آئے گا جب میری ارتھی اُٹھیگی۔ اتنے اتنے بچّوں سے میری بے عزّتی کرواتے ہو۔“ ماں آنکھوں پر پلّہ رکھ کر رونے لگی۔ دیدی اور بھیّا آگئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگے۔ اندر آنے کی ہمّت نہ کر سکے۔

”کیوں گیا تھا وہاں۔“ پتاجی نے کڑک کر پوچھا۔

میں سہم گیا۔ پہلی بار وہ اس طرح کڑکے تھے۔ ان کے نتھنے پھُول رہے تھے اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ چہرہ دمک رہا تھا۔ انھوں نے پورے زور کا تھپّڑ میرے گال پر جڑ دیا میں لڑکھڑا گیا —— کون تھی وہ تیری کیوں گیا تھا وہاں ——“ پتاجی نے حقّے کی نَے نکال لی تھی اور دھڑا دھڑ مجھ پر برسانے لگے اور بار بار ایک ہی جملہ دُہرا رہے تھے۔ ”کون لگتی ہے وہ تیری“ وہ مجھے اس وقت تک مارتے رہے جب تک نَے ٹوٹ نہیں گئی۔

ماں نے رونا بند کر دیا تھا اور دہشت زدہ سی بیٹھی مجھے تکے جا رہی تھی۔ پتاجی نے پھینک کر تھکے ٹوٹے سے کرسی پر گر پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ان پر بے اختیار پیار آگیا اور ماں پر شدید غصہ۔

"کتنی بے دردی سے مارا ہے بچّے کو۔" ماں دیوار کے ساتھ لگی کہہ رہی تھی۔ "اس رانڈ سے پوچھو جا کر جو میرے پیچھے پڑی ہے۔ اس کے تن بدن میں کیڑے پڑیں۔ سات جنم اندھی ہو۔"

"بکواس بند کرو۔" پتاجی چیخے۔

پہلی مرتبہ میں نے انھیں گھر میں اس طرح بولتے سُنا تھا۔ ایک دم ماں خاموش ہو گئی تھی۔ گھر پر سنّاٹا چھا گیا تھا۔ مَیں خوش ہوا کہ وہ اس طرح گرجتے تھے۔ میں بہ مشکل تمام خود کو سنبھالتا ہوا اپنے بستر پر جا کر ڈھیر ہو گیا۔ پتاجی کوٹ پہن کر جب چلے گئے تو ماں دیر تک پاروتی کو کوستی رہی۔ مَیں بستر پر پڑا رہا۔ میرا تمام بدن دکھ رہا تھا۔ مَیں چاہ کر بھی رو نہیں پا رہا تھا۔

اس رات پتاجی بہت دیر سے لوٹے۔ دیر تک ان کے قدموں کی آواز کمرے میں سُنائی دیتی رہی۔ جیسے وہ جلدی جلدی چکّر لگا رہے ہوں۔ گھر میں سنّاٹا چھایا تھا۔ ماں ایک "میانی" میں جا کر سوئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ پھر وہ بھاری قدم مجھے اپنی طرف آتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ مَیں نے بند آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پتاجی مجھ پر جھکے کھڑے ہیں۔ اور غور سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ پھر وہ بستر پر بیٹھ گئے اور دھیرے دھیرے میرے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ مجھے لگا کہ وہ درد وہ جلن ان اُنگلیوں نے باہر کھینچ لی ہے۔ اور میں بھلا چنگا اور پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ہوں میں آنکھیں نہیں کھول سکا۔ مَیں محسوس کر رہا تھا کہ پتاجی کا چہرہ اُترا ہوا ہے۔ اُداس ہے اور مَیں اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گا۔

پھر وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور اس رات بھوک کے باوجود مجھے نیند آگئی۔

کئی دن میں اسکول نہیں گیا۔ کھیلنے بھی نہیں گیا۔ ان دنوں ماں پتاجی سے لڑی بھی نہیں۔ لیکن فضا زیادہ بوجھل اور سرد سی رہی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ پاروتی کیسی ہے۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پتاجی ان دنوں اور بھی دور ہو گئے تھے وہ سر ٹکائے خاموش بیٹھے حقّہ پیتے رہتے یا اخبار پڑھتے رہتے۔ وہ مجھے دیکھ کر چلے جاتے۔

جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو وہ مجھے اپنے ساتھ سیر کرانے لے گئے اور میں بھول گیا کہ انھوں نے مجھے مارا تھا۔ نہر کی پٹڑی پر خشک بھورے پتّوں پر چلتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "بیرونی مار سے اندر کی مار زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ وہ مار جو ضمیر مارتا ہے۔ یہ مار تو تم نے برداشت کر لی ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہ کرنا۔ اس کی مار برداشت نہیں کر سکو گے۔"

سکول کے سال ختم ہو گئے۔ میں پاروتی سے بے دھڑک ملنے لگا۔ اس کے بالوں میں سفید تار نظر آنے لگے۔ وہ بال اب بھی کھُلے رکھتی تھی۔ میں نے اس سے ایک آدھ بار پُوچھا بھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ہنس کر کہتی "تو تو پاگل ہو گیا ——" اور ہماری باتیں اس طرح بھٹک جاتیں اور میرا سوال سوال ہی رہ جاتا۔ ماں اب زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ دیدی کی شادی ہو گئی تھی۔ بھیّا ہوسٹل میں چلا گیا تھا۔ ماں تو جیسے تھک گئی تھی۔ لیکن پتاجی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی بس سیر اور وہی گھر میں آرام کرسی پر بیٹھ کر حقّہ گڑگڑانا۔

میں کالج کی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا اور پتاجی کی باتیں کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھیں اُنھوں نے بات کرنا کم کر دیا تھا۔ میری زندگی بھی گھر کی چار دیواری سے باہر پھیلی وسیع دُنیا میں غوطے لگا رہی تھی اور سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہر چیز ہر شے کے معنی بدل رہے تھے۔ رُوپ بدل رہے تھے۔ باہر سے تو وہی روپ تھا لیکن اندر سے کچھ اور نظر آنے لگا تھا۔

میں اب بہت کم پاروتی کے ہاں جاتا۔ در اصل باہر میری دلچسپیاں بڑھ گئی تھیں

کئی دن گزر جانے پر جب میں پاروتی کو ملنے جاتا تو وہ بہت اُداس سی ملتی۔ اور ایسی باتیں کرتی جیسے وہ سب کچھ تیاگ چکی ہو۔

پھر جب ایک دن میں پہنچا تو پاروتی کمبل لیے پڑی تھی اور سردی محسوس کر رہی تھی۔ مَیں نے جب اس کی نبض دیکھی تو بخار معلوم ہوا۔

"تمھیں تو بخار آنے لگا ہے۔"

وہ مسکرا دی۔

"دوا کھائی؟"

"اب بس۔"

"کیا بس؟"

"بیٹھ جا اب تو تُو بھی نہیں آتا رے۔"

"میں وہ۔ دراصل بات یہ ہے کہ ... ..."

"مَیں سب سمجھتی ہوں۔" وہ ہنسی "اب یار دوستوں میں جی لگتا ہوگا۔ دیکھ پڑھائی کا حرج مت کرنا۔ نہیں تو کان لمبے کر دوں گی۔"

"اچھا مَیں تمھاری دوا لے آؤں۔"

"—— میرے پاس بیٹھ جا" اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ ایک منٹ تو میں خاموش دیکھتا رہا۔ پھر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"رونے لگیں۔"

"کچھ نہیں"۔ وہ آنسو پونچھنے لگی۔

پھر وہ بولی۔ "اچھا ایک بات تو بتاؤ مَیں اگر مر گئی تو تُو مجھے یاد کرے گا۔"

"ایسی باتیں کرو گی تو مَیں چلا جاؤں گا۔"

"ہاں تو ابھی چلا جا جا چلا جا۔" وہ پھر رونے لگی۔

"دیکھو میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

وہ خاموش رہی۔ میں جا کر اس کی دوا لے آیا۔

دوسرے دن اس کا حال معلوم کرنے گیا۔ بخار بڑھ گیا تھا۔ اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ گھبرا کر میں ڈاکٹر کو بلا لایا اور اس کے مشورے پر پاروتی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

جس وقت میں نے ایمبولنس گاڑی کے لیے فون کیا تو پتا جی کمرے میں تیز تیز چکر لگا رہے تھے۔ بار بار وہ سیڑھیوں کی طرف جاتے۔ پھر لوٹ آتے۔ آخر کرسی پر جیسے ڈھیر ہو گئے۔ اور سر تھام کر بیٹھ رہے۔

تین چار دن ان کی یہی کیفیت رہی۔ وہ جیسے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتے پھر رہ جاتے۔ ہمارے گھر میں پھر ایک عجیب سا سناٹا آ گیا تھا جیسے اب کچھ ٹوٹنے والا ہے۔ ماں جو تھک سی گئی تھی۔ اب پھر اپنے آپ کو جیسے تر و تازہ محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ غور سے پتا جی کی طرف دیکھتی اور پوجا کے کمرے میں چلی جاتی اور دیر تک وہاں گھنٹیاں بجاتی رہتی۔ مجھے دن میں تین چار مرتبہ ہسپتال جانا پڑتا۔

ایک دن ماں جب پوجا کے کمرے میں تھی تو پتا جی میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور چند ثانیے وہ اس طرح مجھے دیکھتے رہے۔ پھر چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے نڈھال سی آواز میں بولے۔

"تیرے پاس پیسے ختم ہو گئے ہوں گے اور ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا۔"

اسی شام پاروتی نے پران تیاگ دئے۔ میں اس وقت ہسپتال میں ہی تھا۔ پاروتی مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اس کے ہونٹ ہلے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ بس آخری سانس لیا۔ اس کے کھلے بال تکیے پر

پھیلے ہوئے تھے۔

پاروتی کے پھول میں نے پرواہ کئے۔ اب اس کی یاد باقی ہے۔

گھاٹ سنسان ہے اور ذرا فاصلے پر جلتی ہوئی دھیمی سی زرد روشنی بالکل اکیلی اکیلی سی لگ رہی ہے۔ لیکن وہ سلاخوں والی کھڑکی اب بند ہو گی۔ کسی نے میرے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا ہے۔ شاید چوکیدار ہے۔ اب مجھے چلنا چاہیئے۔

چوکیدار نہیں پتاجی ہیں۔ وہ مند مند بہتے پانی اور اس پر جھلملاتی روشنیوں کو دیکھ رہے ہیں —— اور میں ان کے دل کی گہرائیوں کو جھانک رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سامنے ایک ساز ہے جس کا تار ٹوٹ گیا ہے اور ایک درد بھری جھنکار ساری فضا میں پھیل رہی ہے اور پھیلتی جا رہی ہے۔

رام لعل

مجھے پہچانو

نئی کالونی میں اپنا کلینک کھولے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہاں ایک روز اچانک شوی سے ملاقات ہو گئی۔ شوی تو اس کے بچپن کا نام تھا۔ میں نے اسے اسی نام سے مخاطب کیا تو لمحہ بھر کے لیے وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔ پھر بولی۔ میں مسز اگروال ہوں۔ تین روز سے اس کلینک کے باہر ڈاکٹر ریوتی سرن سکسینہ کی نیم پلیٹ دیکھتی ہوئی گذر جاتی ہوں۔ دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی یہ تم ہی ہو گے۔ کیوں کہ مجھے یاد تھا تم نے یونیورسٹی چھوڑ کر میڈیکل میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن صبح تمھارا کلینک بند کیوں ملتا ہے۔ آج تو میں طے کر کے۔ صبح کے بجائے شام کو آئی ہوں کہ تم سے ملاقات کر کے ہی جاؤں گی۔

دس سال کے بعد بھی وہ وہی شوی تھی۔ بڑی اپنائیت سے مجھے تم تم کر کے مخاطب کرنے والی اپنے قدرتی طور پر سرخ اور انتہائی ہونٹوں کو بار بار دانتوں تلے دبا کر بے ہوش ہوئی اندرونی خوشی کو روکتی ہوئی سی۔ میں سمجھ گیا وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہے۔ لیکن بڑی کوشش سے سنجیدہ اور پر سکون نظر آنے کی کوشش میں بھی ہے۔ تین سال کی ایک شادی شدہ عورت کو اپنے ماضی کے کسی بوائے فرینڈ سے اچانک ملاقات ہو جانے پر ایسا ہی نظر آنا چاہیے تھا۔

میں نے اس سے بتایا" صبح تو ایک ہاسپٹل میں نوکری کرنے جاتا ہوں اور دوپہر مریضوں کے یہاں جایا کرتا ہوں۔ شام کو بس دو ہی گھنٹوں کے لیے اپنے کلینک میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

اس کے بعد جیسا کہ مجھے توقع تھی اس نے مجھ سے میرے گذشتہ زمانے کے بارے میں بھی پوچھا جو کڑے دس برسوں پر پھیلا ہوا تھا۔ یونیورسٹی سے میڈیکل کالج۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے ایک ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں کمپلسری سروس۔ اس کے بعد ملٹری کی سروس اور اسی دوران میں ٹانگ پر گولی کھا جانے سے ایک مستقل لنگ لے کر ریٹائرمنٹ۔ میں نے ذرا چل کر اپنے اس لنگڑے پن کا احساس کرایا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مغموم سی مسکراہٹ آگئی۔

اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے ان سے یہی معلوم ہوا کہ اس پر بھی کئی حادثات گذر چکے تھے۔ اس نے کہا— "میں اپنے بچے کو بھی دکھانے کے لیے ساتھ لے آئی ہوں۔ کئی روز سے بالکل اسکول نہیں جاتا ہے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا ہے۔ کبھی پیٹ کا درد کبھی سر درد کا۔ کلاس میں اس کی حاضری چوپٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ سب سے ہوشیار لڑکا یہی تھا اپنی کلاس میں۔ اب سب سے پیچھے بھی یہی رہ گیا ہے۔"

اس نے بچے کو ادھر اُدھر تلاش کیا۔ وہ کلینک کے اندر آیا ہی نہیں تھا۔ اس نے باہر جا کر اسے پکارا— "بیٹو۔ بیٹو"

بیٹو پارک کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر لے آئی۔ میں نے اسے پیار سے اپنے پاس بلایا— "آؤ بھئی بیٹو۔ میرے پاس آجاؤ ذرا۔"

وہ بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ پانچ سال کا۔ شوی نے بھی اسے میرے پاس آنے کے لیے پچکارا۔ "جاؤ بیٹے۔ اپنے انکل کے پاس نہیں جاؤ گے۔ ڈاکٹر صاحب تمہارے انکل بھی ہیں۔"

بیٹو بہت جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ اس کا اچھی طرح معائنہ کر کے میں نے شوی کو بتایا۔ اس کا تو گلا خراب ہے۔ دیکھو اس کے کتنے بڑے بڑے ٹانسلز ہیں۔ بخار نہیں آتا اسے۔ کچھ روز کے لیے اس کا اسکول جانا بند کر دو۔ کیوں بیٹو۔ تمھیں اسکول سے ایک ایک کی چھٹی دلوا دوں۔ کون سے اسکول میں پڑھتے ہو۔ تمھاری پرنسپل کے نام ایک لیٹر لکھے دیتا ہوں۔“

چھٹی کا نام سن کر بیٹو خوش ہو گیا۔ اس نے اپنی ممی کی طرف بڑی فخریہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے ایک انجکشن لگایا تب بھی وہ بالکل نہیں رویا کیونکہ اب اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ میں اسے اسکول سے نجات دلا دوں گا اور انجکشن کے بعد تو اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے کی بھی مکمل آزادی ہو گی۔

انجکشن لگوا کر وہ سچ مچ باہر بھاگ گیا۔ میں نے شوی سے کہا ” دیکھو بیٹو کہیں دور نہ نکل جائے “

” فکر مت کرو۔ گم نہیں ہو گا۔ ہمارا گھر بالکل پاس ہی ہے۔ بیس تیس گز کی دوری پر ــــ لیکن ڈاکٹر سکینہ میں تمھیں کبھی اپنے گھر انوائیٹ نہیں کر سکوں گی۔“

وہ اچانک چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے بسی سی جھلک اٹھی جو کسی اندرونی کرب سے ملوث تھی۔ کچھ لمحوں تک ہم دونوں ہی خاموش سے بیٹھے رہ گئے۔ خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیے۔ لیکن ہمارے درمیان ماضی کا کوئی مشترکہ رومان حائل نہیں تھا۔ اگرچہ ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ یوں تو وہ خاصی قبول صورت تھی لیکن اس نے کسی کو بھی لفٹ نہیں دی تھی میں نے بھی کبھی پیش قدمی نہیں کی تھی بس اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو لیتا ہوں۔ کسی خوبصورت چہرے کو دور سے دیکھ کر اگر کوئی خوشی مل سکتی ہے تو وہ مجھے حاصل رہی تھی۔ میں بس اسی ٹائپ کا لڑکا تھا۔ اس زمانے میں کئی لڑکے میری عجیب فطرت

پر ہنسا بھی کرتے تھے۔

یاد آیا کالج کے زمانے میں ایک لڑکا شوی کے پیچھے بُری طرح پڑ گیا تھا۔ منیش نام تھا اس کا۔ ایک بار تو اس نے شوی کو اٹھا لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔ کسی سے جیپ مانگ کر لے آیا تھا لیکن ناکام رہا۔ پھر اس نے شوی کے خلاف ایک اور اسکینڈل کھڑا کرنے کے لیے مرن برت رکھ لیا۔ یونیورسٹی کی دیواروں پر جگہ جگہ لکھوا دیا اگر شوی نے اس کے ساتھ التفات نہ برتا تو وہ اپنی جان ہی دے دیگا۔ اس حرکت پر منیش کو یونیورسٹی سے ہی نکال دیا گیا۔ شوی کے بارے میں یہ بہت مشہور ہو گئی تھی کہ وہ بے حد مغرور ہے۔ اس کے غرور سے انتقام لینے کے لیے منیش نے ایک بار اس پر تیزاب سے بھری ہوئی شیشی بھی پھینکی۔ عجیب ضدی واقع ہوا تھا۔ وہ بھی۔ لیکن شوی کی خوش قسمتی سے تیزاب کی شیشی اس کے پاس سے ہو کر دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ اس طرح وہ بال بال بچ گئی۔ ورنہ آج شاید وہ زندہ بھی نہ ہوتی۔ ہوتی تو وہ بے حد بدصورت ہو گئی ہوتی۔

اچانک مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ وہ منیش بھی تو اگروال ہی تھا۔ شوی نے تھوڑی دیر پہلے خود کو مسز اگروال بتایا تھا۔ میں نے کہا — "تم اگروال فیملی میں جانے سے بچ نہیں سکیں نا۔ اس منیش کی حرکتیں تو مجھے آج تک یاد ہیں۔ تمھیں بھی بھولی نہیں ہوں گی۔

شوی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا کر بولی۔ "میں اس سے بچ کر جا بھی کہاں سکتی تھی اسی کے ساتھ تو شادی ہوئی ہے میری۔" "ارے" میں چونک اٹھا۔ تو منیش کا بچہ اتنی لمبی جدوجہد کے بعد اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ شوی سے کہا۔ اچھا اچھا۔ تم منیش کی ہی وائف ہو۔ خوب کیا کرتا ہے وہ۔ میں اس سے فوراً ملوں گا۔ وہ مجھ سے مل کر خوش ہو گا نا۔

شوی کی آنکھوں سے اچانک افسردگی جھلک پڑی۔ بولی۔ کیا کرو گے اس سے مل

کر۔ لوگے تو تمھیں بہت دکھ ہوگا۔ ہو سکتا ہے مجھ پر غصّہ بھی آئے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں سمجھتی تھی جس آدمی نے مجھے حاصل کرنے کے لیے جی جان کی بازی لگا رکھی ہے وہ مجھے پاکر بہت خوش ہوگا۔ میرے ساتھ ہمیشہ محبت سے پیش آئے گا۔ لیکن ہمارے تین چار سال ہی ہنسی سے گذر سکے۔ اس کے بعد تو ہمارا گھر میدان جنگ رہنے لگا۔ گالی گلوج مار پٹیائی ہی اب روزمرہ کا معمول ہے۔ غصے کی حالت میں جو چیزیں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے اس مجھ پر دے مارتا ہے۔ وہ برتن کراکری کوئی بھی چیز محفوظ نہیں ہے ہمارے گھر میں۔"

شوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جنھیں اس نے جلدی سے پونچھ ڈالا۔ اور پھر باہر دیکھنے لگی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی اور مریض نہیں تھا اس لیے میں بڑے اطمینان سے اس کی آپ بیتی سنتا رہا۔ اس نے مجھ سے کوئی بھی بات نہ چھپائی۔ سب کچھ بلاتکلف بیان کر دیا۔

"منیش کے پیچھے پیچھے پھرنے سے عاجز آکر میں نے ہار مان لی تھی" اس سے مجبوراً ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس سے شادی کر لینے کے لیے کہا تو اس نے انکار نہ کیا۔ لیکن اس شادی کے لیے میرے ماں باپ رضامند نہیں ہو سکتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ وہ منیش سے کس قدر نفرت کرتے تھے۔ شادی کر لینے کے بعد ہی میں منیش کو ساتھ لے کر اپنے گھر گئی تو میرا خیال تھا کہ ڈیڈی اور ممی مجھے معاف کر دیں گے۔ منیش کو بھی قبول کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ڈیڈی تو یہ صدمہ برداشت ہی نہ کر سکے۔ دل کے مریض تو پہلے سے تھے ہی۔ اب ایک ہی جھٹکے میں چل بسے۔ میری ممی اس غم سے پاگل ہو گئی۔ اس نے بیوہ ہو جانے کے لیے مجھ ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ سب کے سامنے مجھے سخت برا بھلا کہا۔ میں سمجھتی تھی دھیرے دھیرے وہ نارمل ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ ابھی تک مجھے گالیاں دیتی پھرتی ہے۔ جہاں میں مل جاتی مجھے پکڑ کر کوسنے لگتی ہے۔

میں اس کے پاس کبھی نہیں جا سکتی۔ اس کے تو سامنے ہونے سے ہی ڈرتی ہوں۔"

شوی نے رو رو کر یہ بھی بتایا "ایک ٹریجڈی اور بھی ہوئی۔ منیش کو اچانک یہ شک ہوگیا ہے کہ بیٹو اس کی اصلی اولاد نہیں ہے۔ میں اسے کیسے یقین دلاؤں۔ اس کے اس رویے نے میری زندگی کو نرک بنا دیا ہے۔

یہ کہتے کہتے اس نے اپنی پیٹھ پر سے ساڑی اور بلاوز ہٹا کر جلد پر پڑے ہوئے گہرے گہرے داغ دکھائے۔ کالے اور بھورے۔ انھیں دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ شوی بولی۔ اولاد سے تو باپ کی خوشبو پھوٹ کر نکلتی ہے۔ باپ کا خون اپنی اولاد کے لیے ابلتا کیوں نہیں مجھے اپنی مار کا غم نہیں ہے۔ لیکن میرا جی اس بات پر ہر دم کڑھتا رہتا ہے کہ منیش بیٹو کو کیوں مارتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ جس کمرے میں ہم سوئیں وہیں پر بیٹو بھی سوئے۔ لیکن بیٹو تو ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے الگ نہیں ہوتا۔ رات کو بھی میرے ہی ساتھ لپٹ کر سوتا ہے۔ منیش اسے اکثر میرے سینے سے نوچ کر الگ کر دینے کی کوشش کرتا ہے بیٹو زور زور سے چیخ اٹھتا ہے۔ باپ کا غصے سے لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ کتنی بار رو رو کر اس سے پوچھ چکا ہے۔ "پاپا مجھے کیوں مارتے ہو۔ کیا تم میرے پاپا نہیں ہو۔"

اچانک وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "اوہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ منیش دفتر سے آ چکا ہوگا کہیں بیٹو بھی گھر نہ پہنچ گیا ہو۔ میں باپ بیٹے کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس بات کو سوچتے ہی میری آتما پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے میز پر سے دوا کی پڑیا اٹھا لیں۔ اور میرے سامنے پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔ میں نے نوٹ اسے واپس کر دیا۔ بنا کسی تبصرے کے اس نے بھی پیسے دینے کے لیے ضد نہ کی اور وہ سر جھکا کر باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں کتنی دیر تک گم سم بیٹھا رہ گیا۔ ایک پہاڑ کے نیچے دبا ہوا سا۔ شوی کے دکھوں کا انت کیا ہوگا۔ کسی دن تنگ آ کر وہ جان ہی نہ دے دے۔

مرد کسی لڑکی کو اپنے ماضی میں ایک بار محبت کی نظر سے دیکھ لیتا ہے تو پھر وہ اس کے دل سے کبھی دور نہیں ہوتی۔ پھر وہ جہاں بھی اس سے مل جاتی ہے۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس کی ہمدردی پھر سے حاصل کر لیتی ہے۔ اگر وہ مصیبت زدہ ہوتی ہے تو مرد اس کے لیے صرف ایک ہی حل سوچ سکتا ہے۔ وہ کسی بھی طرح اس کے آغوش میں چلی آئے جہاں وہ ہر مصیبت سے محفوظ ہو جائے گی۔ ایسا سوچنا اگرچہ غلط بھی ہوتا ہے۔ غیر منطقی بھی، لیکن مرد سوچتا اسی طرح سے ہی ہے۔

میں نے بھی اسی قسم کی کئی باتیں سوچیں۔ سوچ سوچ کر انھیں ناقابل عمل بھی قرار دے دیا اور اس الجھن سے نکلنے کے لیے پھر کوئی دوسرا حل تلاش کرنے لگا۔ آنکھیں بند کر کے اس طرح بیٹھے بیٹھے مجھے کافی دیر ہو گئی۔ وقت کے گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اچانک میں نے آنکھیں کھولیں اور گھر جانے کے لیے اٹھا تو سامنے کرسی کے پیچھے ایک بچے کو کھڑا ہوا پایا۔ جو کیبن کی جالی میں سے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

وہ بیٹو تھا۔ ابھی تک گھر نہیں گیا تھا۔ نو بج رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اس کے پاس جا کر پوچھا “بیٹو تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کب سے کھڑے ہو۔ گھر کیوں نہیں گئے۔ تمھاری ممی تو بہت دیر ہوئی گھر چلی بھی گئی۔

لیکن وہ میری باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ کوئی جواب بھی نہ دیا۔ اسی طرح کرسی کی پشت کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے پکڑے سر اٹھا کر مجھے گھورتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں گھر نہ جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ اپنی ماں سے بچھڑنے کا بھی کوئی ملال نہیں تھا۔ وہاں تو بس ایک قسم کی بغاوت کی جھلک تھی۔ گھر واپس نہ جانے کی معصوم اور پیاری سی بغاوت۔

میں نے اسے اٹھا کر کرسی پر کھڑا کر دیا۔ اس طرح اس کا پورا چہرہ میرے

سامنے آگیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگے۔ اس کے سنہرے بال ماتھے پر جھک آئے تھے۔ اس کے گالوں ہاتھوں اور بوٹوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اس کی نیکر کی جیبوں میں چھوٹے چھوٹے سنگریزے بھرے ہوئے تھے۔ انھیں میں نے نکلوا کر باہر پھینک دیا۔ اس کے گالوں کو پیار سے تھپتھپا کر کہا "اگر پتھر بھروگے تو جیبیں پھٹ نہیں جائیں گی۔

وہ بڑا اعتماد سے میری طرف دیکھنے لگا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔ میں نے تولیے سے اس کا ہاتھ منہ پونچھ دیا اور بغل کے اسٹور سے اس کے لیے بسکٹ لینے چلا گیا واپس آیا تو اسے میز پر چڑھ کر اسٹیتھسکوپ کو گلے میں ڈال کر اسی سے کھیلتے ہوئے پایا۔ میرے ہاتھوں میں بسکٹ دیکھ کر فوراً ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "بیٹو گھر جاؤ گے۔ ممی کے پاس"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مزے سے کچر کچر بسکٹ کھاتا رہا۔

یہ سوچ کر میں پریشان ہونے لگا کہ شوی اس کے بغیر گھبرا رہی ہوگی۔ منیش تو غالباً خوش ہی ہوگا کہ ناجائز اولاد سے اس کی اپنے آپ ہی گلوخلاصی ہوگئی۔

مجھے ان کا گھر معلوم نہیں تھا۔ بیٹو سے پھر کہا۔ "چلو بیٹو"، اب گھر چلیں اپنا گھر ڈھونڈ لوگے نا۔

میرے اصرار پر پہلی بار بیٹو کی آنکھوں میں خوف کی جھلک دکھائی دی۔ گھر جانے کے ذکر سے ہی وہ چونک گیا۔ لیکن اسے گھر پہونچانا ضروری تھا۔ میں اسے پچکار کر باہر لے گیا۔ کلینک بند کر دیا اسے اپنے اسکوٹر پر کھڑا کر کے کہا۔ "تم کتنے اچھے ہو بیٹو۔ مجھے اپنا گھر دکھاؤ گے نا۔ میں تمہارے گھر جاؤں گا۔ تمہاری ممی سے ملوں گا۔ تمہاری ممی کتنی اچھی ہے۔ تمھیں دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔ اپنے بیٹو کو دیکھ کر گلے سے لگالے گی کہے گی، "آیا میرا پیارا بیٹو آگیا۔ میرا بیٹو آگیا۔ لو اب ہم تمہارے گھر چل رہے ہیں۔

چلیں نا۔

لیکن میٹو نے کوئی جواب نہ دیا۔ گھر جانے کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی خفگی پیدا ہو جاتی تھی فطری معصوم خفگی جس کے سامنے میں نے خود کو نادم بھی محسوس کیا۔ جیسے اس کے گھر لے جا کر میں اس کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ اس احساس سے مجھے بڑا دھکا لگا۔ لیکن میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

سکوٹر اسٹارٹ کر کے میں اسے سامنے کی گلی میں لے گیا۔ گلی بہت دور تک گئی ہوئی تھی۔ دونوں طرف مکانات تھے جن میں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ شوی نے کہا تھا ان کا گھر بہت دور نہیں ہے بیس تیس گز کے ہی فاصلے پر ہے۔ اندازے سے بیس تیس گز جا کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کسی بھی ایسے مکان کے بارے میں یقین نہ ہو سکا کہ شوی اور منیش اسی میں رہتے ہوں گے۔ میٹو سے پھر پوچھا لیکن اس نے تو چپ سادھ رکھی تھی۔

گلی کے دو چکر لگائے۔ ایک مکان کے دروازے پر دستک بھی دے دی لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ راستے میں دو آدمیوں سے بھی پوچھا لیکن وہاں منیش اگروال کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ایک صاحب جو اس گلی سے اچھی طرح واقف تھے بڑے ذوق سے بتانے لگے۔ اس گلی میں تو اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا ہے۔

میرے لیے ایک اور صدمہ تھا۔ حیرت میں مبتلا کر دینے والا۔ میٹو کو میں کس کے حوالے کر دوں۔ اسے گھر لے جاؤں تب بھی شوی اور منیش کی تلاش کا مسئلہ ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ شوی کو خود ہی میرے پاس چلے آنا چاہیے تھا میٹو کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔ میں نے پھر کلینک کی طرف اسکوٹر گھما دی۔ ممکن ہے وہ ابھی گئی ہو۔

اب ہم پھر کلینک میں تھے۔ میٹو اور میں کلینک میں واپس آ کر میٹو بہت خوش

نظر آیا۔ فرش پر ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔ دواؤں سے بھری ہوئی شیشے کی الماریوں پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیرتا رہا۔ شیشے کے ساتھ اپنی ناک چپکا کر اپنے عکس کو گھورا۔ کبھی کبھی سر گھما کر میری جانب اس طرح دیکھا کہیں میں نے اپنا فیصلہ بدل تو نہیں لیا۔ اسے پھر گھر پہنچانے کے لیے باہر تو نہیں لے جاؤں گا۔

اچانک مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ دس بج چکے تھے۔ بیٹو کی بھوک کا بھی خیال آیا لیکن میں نے اسے کافی بسکٹ کھلا دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہاں اس قدر خوش تھا کہ اسے شاید بھوک محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے لیے اور بھی بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔

کیا بیٹو کو اب گھر لے جاؤں۔ پیچھے سے شوی اسے تلاش کرتی ہوئی کسی بھی وقت آسکتی تھی۔ اس نے اپنے پتی کو کتنا کوسا ہوگا۔ مجھے یقین تھا بیٹو کو غائب کر دینے کے لیے اسی کو ملزم ٹھہرایا ہوگا۔

میں بیٹو کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ کلینک کے اندر ہی مجھے اپنے ساتھ ٹہلتا دیکھ کر اس نے پہلے تو حیرانی دکھائی۔ پھر وہ مسکرا دیا۔ میں نے اس سے انگلی پکڑ لینے کے لیے کہا تو اس نے فوراً پکڑ لی اور ایک الماری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا— ”انکل اس میں کیا ہے۔“

میں نے اسے بتایا— ”اس میں دوا ہے۔“

اس نے یہ اطلاع ایک عجیب سے احساس برتری کے ساتھ نکالی اور پھر ایک اور الماری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے۔“

”اس میں بھی دوا ہے“

اب وہ کچھ لمحوں تک خاموش رہا۔ کچھ سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا— اب کوئی بیمار ہو جائے تو بھی دوا کھانے سے ٹھیک ہو جاتا ہے“

چلتے چلتے اس نے پھر ایک اور اشارہ کر دیا ”یہ کا ہے“

”یہ داش بین ہے۔ جب ہاتھ منہ میلے ہو جاتے ہیں تو ٹونٹی کھول کر پانی سے دھو لیتے ہیں۔“

داش بین تک اس کا قد نہیں پہنچتا تھا وہ اس کے سامنے رک کر بولا۔ مجھے دکھائیے۔“

میں نے اسے اٹھا کر داش بین دکھایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر میرے بازو سے اتر کر ننھے ننھے قدموں سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ اس کی خواہش ہوئی کہ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگوں۔ جب میں نے ویسا ہی کیا تو وہ بھاگ کر پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا اور میرے پہنچنے سے پہلے ہی ایگزامینیشن ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھ گیا نرم نرم گدے پر اپنی انگلیاں گھما کر بولا۔ ”یہ کا ہے“

یہ گدا ہے ”اس پر لیٹتے ہیں۔“

یہ سن کر اس نے مزید خوشی دکھائی اور بولا۔ ”میں لیت جاؤں“

”لیٹ جاؤ“

وہ جلدی سے تکئے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ پہلے تو دائیں بائیں کروٹیں بدلیں پھر چھت پر نظر جما کر بولا۔ ”وہ پنکھا تتا ہے۔“

”ہاں چلتا ہے“ میں نے ہاتھ بڑھا کر پنکھا آن کر دیا۔ ہم دونوں ایک سی ہی خوشی سے سرشار ہو رہے تھے۔ وہ میرے اچھے سلوک سے زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی بھوک کا احساس کر کے اسے بسکٹ لا دئے۔

”لو کھا لو بھوک لگی ہے نا۔“

اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر بلا دیا۔ اور میرے ہاتھ سے بسکٹوں کا ڈبہ لے لیا۔ میں نے اپنے دونوں بازوؤں کے سہارے

اس پر قریب قریب جھک کر کہا ــــ " مجھے بھی بھوک لگی ہے ۔ مجھے نہیں کھلاؤ گے ۔"

اس نے میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں۔ جب میں نے دیر تک اپنا منہ کھلا رکھا تو اس نے ہنس کر ایک بسکٹ میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ جلدی جلدی بسکٹ چبا کر میں نے ایک اور مانگا تو اس نے دوسرا بسکٹ دینے سے پہلے پوچھا " مجھے پاپا کے پاس تو نہیں لے جایئے گا ۔"

اس کی آنکھوں میں پھر ایک خوف سا بھر گیا۔ میں نے ایک ہی لمحے کے اندر سوچ لیا۔ بچہ میرے پاس بھی رہ سکتا ہے ۔ اس سے بتایا ــــ " نہیں کبھی نہیں لے جاؤں گا۔"

وہ خوش ہو اٹھا۔ اس نے بسکٹ میرے منہ میں دے دیا اور کہا " اب کھایئے نا ۔" میں نے جلدی جلدی بسکٹ چبا کر نگلا اور اس سے پوچھا ۔" بیٹو تمہیں پاپا اچھے نہیں لگتے ۔"

اس نے اُداس ہو کر جواب دیا ــــ " مجھے پیار نہیں کرتے ۔"

" وہ پیار کریں تو جاؤ گے ان کے پاس ۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ جیسے یقین ہی نہ کر سکا ہو کہ پاپا اس سے کبھی پیار بھی کرے گا۔

میں نے پھر پوچھا۔ اچھا ممی کے پاس تو جاؤ گے ۔ لے چلوں " اس نے منہ میں بسکٹ بھرتے ہوئے کہا ــــ " ممی نے کہا تھا تم انکل کے پاس رہنا میں بھی آؤں گی ۔

میں یکایک چونک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کیا تمھیں ممی نے یہاں بھیجا تھا۔ میرے پاس تمہیں ممی چھوڑ کر گئی تھی ۔"

اس نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔" ہاں ۔ ممی مجھے دروازے کے پاس تھول کے تلی گئی تھی۔

مجھے ایسی امید نہیں تھی شوی سے ۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔ وہ مجھ سے کہہ بھی سکتی تھی ۔ میں تو اس کی ہر مشکل آسان کرنے کے لیے تیار تھا ۔ گو وہ چاہتی تو میں میٹو کو اپنا بیٹا بھی مان سکتا تھا ۔ محض اس کی مصیبت ختم کرنے کے لیے یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا ۔ جب وہ خود ہی میٹو کو یہاں چھوڑ گئی ہے ۔ تو پریشان کیوں ہو رہی ہوگی ۔ اسے ڈھونڈتی ہوئی پھر یہاں کیوں آئے گی ۔ اب وہ کل ہی میٹو کو دیکھنے آئے گی ۔ میں نے ناحق اتنا سمے برباد کیا ۔ میٹو کو گھر ہی لے کر چلا گیا ہوتا ۔ اس وقت تک وہ وہاں مزے سے سو رہا ہوتا ۔

اب میں فوراً ہی میٹو کو گھر لے جانے کے لیے تیار ہو اٹھا ۔ جلدی سے اندر گیا تاکہ اسے اٹھا کر باہر لے جاؤں ۔ لیکن وہ تو گہری نیند میں تھا ۔ بسکٹوں کا ڈبہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے نیند میں بھی وہ بہت پیارا لگا ۔ میں نے اس کے ماتھے پر گرے ہوئے بال پیچھے کو ہٹائے اور فیصلہ کر لیا کہ اب وہ رات بھر یہیں سوئے گا اور میں بھی دوسری میز کو خالی کر کے لیٹ رہوں گا ۔

جب میں اسکوٹر کو اندر لے آنے کے لیے باہر نکلا تو اندھیرے میں اچانک دو پرچھائیاں میرے سامنے ابھریں ۔ آگے پیچھے چلتی ہوئی میرے پاس آ کر رک گئیں ۔ ان میں سے ایک نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا ـــ کیا آپ ڈاکٹر سکسینہ ہیں ۔ میرا بچہ آپ ہی کے پاس ہے ۔

میں نے اس کی آواز پہچان لی ۔ وہ منیش تھا ۔ جب اسے کلینک کے اندر روشنی میں لے آیا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ وہ کتنا بدل چکا تھا ۔ ادھیڑ مرجھایا ہوا کھچڑی بال اس نے بھی مجھے حیران ہو کر دیکھا ۔ ہم نے ایک دوسرے کو بے اختیار لپٹا لیا لیکن وہ ایک ہی لمحے کے بعد میرے بازوں میں سے نکل کر پارٹیشن کے پیچھے چلا گیا ۔ میٹو کو ایک نظر فوراً دیکھ لینے کے لیے ـــ

تب تک شوی بھی اندر آگئی ۔ اس نے بہت دھیرے سے مسکرا کر بتایا ــــ آج منیش بہت تڑپا ہے ۔ جب بالکل بے قابو ہونے لگا تب ہی میں اسے یہاں لے کر آگئی ۔"

اس کی آنکھوں میں فتحمندی کی مسرت تھی لیکن وہ بھی میرے پاس زیادہ دیر تک نہ رکی ۔ منیش کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی ۔ باپ بیٹے کی ملاقات کا تماشہ دیکھنے کے لیے ۔

منیش اتنی جلدی بدل جائے گا ۔ مجھے یقین نہ تھا ۔ میں بھی اندر چلا گیا ۔ وہ سچ مچ بیٹو کو سینے سے لگا کر بار بار پیار کر رہا تھا ۔ اسے جگا رہا تھا ۔ یہ کہہ کہہ کر ــ" میں تمھارا پاپا ہوں ۔ بیٹے ۔ مجھے پہچانو آنکھیں تو کھولو ۔

قاضی عبدالستار

نازو

"چھن چھن"

آواز نے کانوں کو چُور چُور کر دیا۔ جیسے اُس کے سامنے اُس کی نازو نے سُرخ چوڑیوں سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھ دہلیز پر پٹخ دئے ہوں۔ دونوں سفید تندرست کلائیاں خون کی چھوٹی چھوٹی مہین مہین لکیروں سے لالوں لال ہوگئیں۔ کتنی شدّت سے جی چاہا تھا کہ اس جیتے جاگتے خون پر اپنے ہونٹ رکھ دوں آج پھر اُس کی زبان نمکین ہوگئی۔ آنکھیں چیخ پڑیں۔ دونوں زخمی کلائیاں دو بچّوں کی لاشوں کی طرح اُس کے پہلو میں جھُول رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو اُبل رہے تھے۔ دھاروں دھار۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ عذابوں کی بددعائیں دے رہے تھے۔ اُسے یقین نہ آرہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے اس کی وہی بیوی ہے، جس کی بے مزہ قربت کی چکّی میں سیکڑوں راتیں پِس کر نابود ہوگئیں۔ طلاق کی چلمن کے پیچھے سے وہ کتنی پُراسرار اور زرنگار لگ رہی تھی۔

ٹریکٹر پھر چلنے لگا۔ تھوڑا سا کھیت باقی رہ گیا تھا۔ گیہوں کی پُوری فصل کٹی پڑی تھی۔ کہیں بڑے بڑے انبار لگے تھے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے ڈھیر۔ جیسے بیتے ہوئے سال اور مہینے۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے ڈھیر کو اپنی چھڑی سے اُلٹ دیا۔ سُنہرے تنکوں اور ڈنٹھلوں کے

ہجوم سے کچھ دانے نکل آئے۔ زندہ اور چمکدار۔ جیسے گزرے دنوں کے ان گنت لمحوں کے بھوسے میں کچھ یادیں چمک رہی ہوں ...... یادیں ہماری بوئی ہوئی اور کھوئی ہوئی فصلوں کے دانے۔ ابھی نہ دھوپ تیز ہوئی تھی اور نہ ہوا گرم۔ لیکن وہ اپنے ادھیڑ جسم کے ساتھ ٹیوب ویل کے پانی سے لبریز پختہ نالی کے کنارے کنارے چلتا ہوا ڈامر کی سڑک پر آگیا۔ اب انجنوں کی آوازیں دور اور دلکش ہونے لگی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف اسکولوں کی زرد عمارتوں میں امتحانوں کے پڑاو پڑے تھے اور شرارتوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ بلاک کے دفتر پر بھیڑ لگی تھی۔ تقاوی اور بیاسے کے کاغذات بن رہے تھے۔ اب وہ بھیڑ سے ڈرنے لگا تھا۔ اُن کی بے ادب نظروں سے کچلے جانے کے خوف نے اُسے ایک گلی میں موڑ دیا، جو کھری اور شاداب آوازوں سے چھلک رہی تھی، شور مچاتے زیوروں اور بھڑک دار کپڑوں سے چمک رہی تھی اور ان سب میں شرابور ہوتا اپنے مکان تک گیا جو اُس کے آبائی مکان کا ایک حصہ تھا۔ دوسرے حصوں میں ہسپتال، ڈاکخانہ اور گورنمنٹ اسٹور تھا۔ اُس نے دروازے پر ہلکی سی تھپکی دی کہ ہسپتال میں انتظار کرتے مریضوں میں سے کوئی جان پہچان والا وقت گزارنے اُس کے پاس نہ آجائے۔

پُورا گھر جیسے بھونسلے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اُس نے لانبے پتلے کمرے میں داخل ہو کر پنکھے کا سوئچ آن کیا جو وہاں اجنبی لگ رہا تھا۔ دروازے پر کسی نے آواز دی۔

"مہر دیں۔"

اور جب نازو طلاق کے کفن میں لپٹی ہوئی زخمی کلائیوں سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے رُخصت ہونے کے لیے ادّھے میں سوار ہوئی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے اُس کے قریب گیا۔

"مَیں تمھارا مہر تمھارے بھائی کو ادا کردوں گا۔"

جواب ملا۔

"وہ اپنی ہونے والی کو میری طرف سے منہ دکھائی میں دیدیجیے گا۔" ایک سناٹا سا چھا گیا۔ وجود کے اندر سے باہر تک سب کچھ شمشان ہوگیا۔ نئی دولھن کے خواب میں بال تو اسی وقت

پڑ گیا تھا جب اُس نے نازو کو آنسوؤں میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس جملے سے تو بڑ تخ گیا تھا اور جب اُس کی اچانک موت کی اطلاع آئی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

آج پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ نازو کے جہیز کی اُونچی مسہری کے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا کہ کہیں گر نہ پڑوں اور جب ہاتھ ہٹایا تو بائیں کان کا دُر دامن میں پڑا تھا۔ سونے کے دُر میں بیضاوی موتی دمک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ اور داہنا ہاتھ ہمیشہ کی طرح داہنے کان پر لرزتا رہا۔ اس لَو میں بھی سُوراخ تھا، اور اس میں بھی بائیں کان کی طرح دُر چمکا کرتا تھا۔ جس رات وہ کھو یا گیا۔ کان کی لَو کا سُوراخ دل میں منتقل ہو گیا۔ ماں نے منّت کے دُر اس لیے پہنائے تھے کہ بیٹے جیتے نہ تھے۔ بچپن لڑکیوں کی طرح برتا گیا۔ دوپٹے اُڑھائے گئے۔ گھروندے بنائے گئے، ہنڈ کلیاں بنائی گئیں۔ گڑیوں کی شادیاں رچائی گئیں۔ اور سب کچھ تو بھُول گیا، چھوٹ گیا لیکن کانوں کے دُر شخصیت کا حصّہ بن گئے۔ خدوخال کی طرح وجود میں شامل ہو گئے۔ وہ نوجوانی میں بھی شوق سے پہنتا رہا۔ پھر دروازے پر شور سا مچ گیا۔ باورچی خانے سے بوڑھی عورت نے کوّے کی طرح کون کون کی رَٹ لگا دی ،،، وہ اطمینان سے سوچنے کے لیے خود باہر نکلا۔ دروازے پر مندر کھڑی تھی۔ ادھیڑ عمر کی گوری چٹی مندر! جس کی جوان رانوں میں اُنھوں نے اپنے بوسوں کے چراغ جلائے تھے۔

”کیا ہے؟“

”میاں! آج برات آ رہی ہے آپ کی بیٹوا کی“

”ہاں ہاں پھر“

”سب انتجام آپ کے ری دعا سے پکّا ہے ... مُمل مسندنائن مل رہی ہے“ مسند ہے تو ... لیکن معلوم نہیں کہاں ہے۔ جب وہ گئیں نہ ضرورت پڑی نہ تلاش کی گئی۔ تم باہر سے کسی کو بھیجو میں ڈھونڈھوا دوں“ مندر کے جانے کے بعد اُس کے تصوّر نے فراغت کا سانس لیا۔

برناپور کی شادی تھی، اور اُس کی نوجوانی۔ باپ کی مَوت کے بعد پہلی بار کسی تقریب میں

شرکت کو نکلا تھا۔ آدھی رات کو کھانا ہوا۔ اور پچھلار سے دولھا اندر آیا۔ تلچوری چلی اور ہنگامہ ہوا۔ بوڑھی بوڑھی کٹکھنی عورتیں جو بولتے جلوؤں پر بھی کاڑھے بیٹھی تھیں ایک ہی ریلے میں بہ گئیں۔ روشنیاں جو دن رہے سے جل رہی تھیں۔ اب سونے لگی تھیں۔ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی عمارت کے کئی حصّے تاریک ہو چکے تھے۔ وہ کوئی چیز لینے اپنے کمرے میں آیا جو اندرونی اور بیرونی عمارتوں کے درمیان دوہرے دالانوں میں چھپا کھڑا تھا۔ وہ دیا سلائی کی روشنی میں لیمپ ڈھونڈھ رہا تھا کہ اندرونی عمارت کی صحنچی میں ایک چہرہ چمک اُٹھا اور اس طرح کہ دیا سلائی نے اُسے جلا دیا۔ وہ اتنا روشن تھا کہ اگر تھوڑا سا اور قریب آ جاتا تو اُس کے اپنے کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے جادو کے زور سے کھنچا ہوا چلا۔ گھاس کے تختوں پر ڈھیر سامان سے بچتا ہوا صحنچی کے سامنے دالان کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔

”میاں سامنے والی کوٹھری میں تو مسند ہے نہیں۔ کاجی جی صاحب کا بڑا بکس کھولیں؟“

”ہاں۔“

صحنچی اس کے نور سے سنگِ مرمر کی بن گئی تھی ..... سانس پھولنے لگا۔ پہلوؤں میں درد کے نشتر اُتر گئے۔ اریبی پائجامے کی چوڑیاں پسینے سے بھر گئیں کہ ایک آواز طلوع ہوئی۔

”آپ“

اور جیسے ہی وہ آگے بڑھا۔ روشنی نور اور رنگ کا ایک پیکر، ایک ہیولیٰ اس سے ٹکرا گیا، اُس پر بکھر گیا۔ داہنے کان پر کنول کا تازہ پھول لرز گیا، اور اس کا کان اُس کے سینے کی طرح خالی ہو گیا اور وہ ایک چھلاوے کی طرح اُس کی باہوں سے نکل گئی اور جب وہ جاگتی آنکھوں کے خواب سے بیدار ہوا تو کمرے میں سپاہی لیمپ جلا چکا تھا۔

”میاں آپ کے داہنے کان کا دُر۔“

پھر بہت سی روشنیاں صحنچی دالان اور صحن میں دُر ڈھونڈھتی پھریں اور بہت دنوں بعد کسی بنت غم نے اسکے حال پر ترس کھا کر بتلا دیا کہ دہبی پور کی بٹیا نازو سے بیاہ کر لیا۔ لیکن دہبی پور

کی بٹیا نازو نے دولہن بن کر ساری ساری تفتیش کے جواب میں صرف اتنا کہا، کہ میں نے تو وہ صنجی دیکھی بھی نہیں، اور اسی گھڑی نازو اس کی نگاہ سے گر گئی۔ خواب جتنا سنگین ہوتا گیا۔ زندہ موجود اور معصوم نازو کی حقیقت اتنی ہی پگھلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آسودگی اور فراغت سے خواب دیکھنے کی آرزو اور تعبیر کو دوبارہ پالنے کی جستجو میں نازو کو طلاق دیدی گئی۔

"میاں! بکس کھل گیا۔"

میاں چونک کر اُٹھے اور خواب میں چلنے لگے۔ لکڑی کا بڑا سا مٹیالا بکس کھُلا پڑا تھا۔

"اسے کیوں کھول دیا کم بختو؟"

"جی؟"

اب کھول ڈالا ہے تو ڈھونڈھو۔

جازم پردے، توشک، لحاف، رضائیاں اور دوشالے نکل نکل کر پھیل گئے، مگر صندوقچہ نہ ملی۔ پھر ایک چھوٹا سا صندوقچہ نکلا جس میں بڑا سا تالا پڑا تھا۔ سامان رکھوا کر وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ صندوقچہ کھولا تو چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور کنمنا کر جاگ اُٹھے۔ گڑیوں کے ننھے منے کپڑے جگر جگر کرنے لگے۔ سونے کی ٹوٹی ہوئی بالیاں ملیں، جن میں ایک سے سیس پھُول پھنسا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنے دنوں بعد وہ پہلی بار تنہائی میں مُسکرایا۔ نازو اور حسین اور قاتل ہو گئی۔ پھر چور خانے سے سونے کا ایک دُر برآمد ہوا۔ جس میں بیضوی موتی پڑا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اگر کھڑے ہوتے تو گر پڑتے۔ سنبھل کر بیٹھے تو ہاتھ نے کان سے دُر کھینچ لیا، اور اس طرح کہ سارے میں ننھے ننھے خون کے نگینے جُڑ گئے۔ وہ دونوں کو ایک ہتھیلی پر رکھے دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے یہاں تک کہ سُن ہو گئے۔

سریندر پرکاش

مُردہ آدمی کی تصویر

وہ مجھے جس کمرے میں بٹھا کر چلی گئی تھی، اس کی کارنس پر ایک تصویر رکھی تھی۔ کارنس پر صرف تصویر ہی نہ تھی ایک پرانا طلائی ٹائم پیس تھا جو پرندوں کے پنجرے کی شکل کا تھا۔ اندر ڈائیل تھا۔ جس پر رومن میں ایک سے بارہ تک کے ہندسے لکھے تھے اور سنہری رنگ کی دو سوئیاں تھیں جو بڑی سست رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اُس پنجرے نما ٹائم پیس کے گِرد ایک چھوٹی سی سنہری چڑیا آہستہ آہستہ دائرے میں چلتی ہوئی دکھائی دیتی۔ جس کے آگے سفید موتی تھے جب وہ آگے بڑھ کر ایک موتی پر اپنی چونچ مارتی تو موتی غائب ہو جاتا اور کرڑک کی آواز آتی۔ حتیٰ کہ ساٹھ بار ”کرڑک“ کی آواز آتی اور چڑیا اپنے محور کے گرد اپنا چکّر پورا کر کے پھر اپنی اصلی جگہ پر پہونچ جاتی۔ ڈائیل پر بنی بڑی سوئی ایک منٹ اور آگے بڑھ جاتی اور چڑیا اپنا سفر پھر سے شروع کر دیتی۔ ”کرڑک، کرڑک، کرڑک۔

کارنس کے دوسرے کونے پر ایک چاندی کا گُل دان رکھا تھا۔ جس میں مور کے کچھ پنکھ سجے ہوئے تھے۔ جب ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا کمرے میں آ داخل ہوتا تو مور کے پنکھ یوں ہلنے لگتے جیسے جنگل میں مور ناچ اُٹھا ہو۔

اِن کے علاوہ کچھ کرسمس اور کچھ نئے سال کے گریٹنگ کارڈ رکھے تھے جن پر بھیجنے والوں

کی نیک خواہشات چھپی ہوئی تھیں۔

تصویر والا آدمی مجھے برابر گھورے جا رہا تھا۔ وہ اندر گئی تھی۔ شاید میرے لیے (اگر گرمی کا موسم ہے تو کچھ ٹھنڈا اور اگر سردی کا موسم ہے تو کوئی گرم) مشروب لینے کے لیے۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اور کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔ سب طرف سے تھک کر نظر پھر اُس تصویر پر آ کر رُک جاتی اور تصویر والا آدمی پہلے سے زیادہ شدت سے مجھے گھورنے لگتا۔

ایکا ایکی مجھے احساس ہوا کہ تصویر والا یہ آدمی جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکدار تھیں، کشادہ پیشانی ذہانت کی غمازی کرتی تھی، موٹے موٹے ہونٹ اور ٹھوڑی کا گہرا گڑھا اُس کی مضبوط قوتِ ارادی کا ضامن تھا، زندہ نہیں بلکہ مر چکا ہے۔

”ہاں، تم نے یہ ٹھیک سوچا ہے یہ واقعی مر چکا ہے!“

میں نے پلٹ کر آواز کی طرف دیکھا۔ وہ اندر سے ایک ٹرے میں چینی مٹی کے کچھ برتن رکھے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور میرے قریب آ کر بولی۔

”یہ میرے خاوند کی تصویر ہے، عرصہ ہوا اُس کی موت ہو چکی ہے۔“

مَیں نے کہا ”عجیب بات ہے، تصویر دیکھنے سے میں کیوں کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ آدمی مُردہ ہے یا زندہ۔! یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے دو ایک واقعات میرے ساتھ پیش آ چکے ہیں۔“

وہ ہنسی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے اُس نے میرے سامنے پڑی میز پر رکھ دی۔ پھر پلٹ کر اندر جاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”خیال رکھنا یہاں سے رہائی مشکل ہے۔ یہ ساتواں آسمان ہے اور خلا میں لڑھک گئے تو کہیں کے نہ رہیں گے!“

مَیں دَم بخود سا اُسے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ اُس نے دروازے کا پردہ اپنے دائیں ہاتھ سے اُٹھایا اور پھر اس کے اندر داخل ہو گئی۔

کچھ دیر تو میں اِدھر اُدھر تاک جھانک کرتا رہا۔ پھر میں اپنے آگے رکھے کھانے کے برتنوں

کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک تو مجھے یہ خواہش تھی کہ خورد و نوش کے سامان سے یہ پتہ چل جائے گا کہ موسم کونسا چل رہا ہے۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب مَیں نے دیکھا کہ میرے آگے رکھے ہوئے تمام برتن بالکل خالی ہیں۔ مَیں جھنجھلا کر رہ گیا۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ مَیں صورتِ حال سے واقف بھی نہیں کروایا جارہا ہوں اور یہ کہہ کر یہاں بٹھا دیا گیا ہوں کہ ”یہ ساتواں آسمان ہے اور باہر بالکل خلا ہے۔“

مَیں نے چاہا کہ اس کا نام لے کر پکاروں مگر مجھے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔ آواز میرے حلق تک آکر رک گئی۔ مَیں بے بسی کے عالم میں اپنی سیٹ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک میری نظر کارنس پر رکھی ہوئی تصویر پر پڑی۔ تصویر والا مرا ہوا آدمی اب ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

میری جھلاہٹ اور بڑھی اور مَیں غیر ارادی طور پر پکار اٹھا۔ ”اے بے نام عورت!“

جواب میں اندر سے اس کے قہقہوں کی آواز سُنائی دی۔ اور پھر لوری گانے کی آواز جیسے وہ کسی بچے کو سُلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

کمرے کی دونوں دیواریں جس کونے میں ملتی تھیں اس جوڑ میں شہد کی مکھیوں کا ایک چھوٹا سا چھتہ تھا۔ دو تین شہد کی مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی تھیں۔ اس قدر خاموشی تھی کہ اُن کی بھنبھناہٹ بڑی واضح طور پر سُنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر تک میں اُن کا بھنبھنانا سُنتا رہا اور اُن کی پرواز کا تماشہ دیکھتا رہا۔

اندر سے آنے والی لوری کی آواز آہستہ آہستہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں دب گئی —— خالی برتن میری طرف بٹر بٹر دیکھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میں نے سوچا اندر جاکر خود ہی بات کر لیتا ہوں۔ ان تکلفات میں تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

مَیں نے آگے بڑھ کر پردہ ایک طرف سرکایا تو دیکھا کہ وہ ایک سونے کا کمرہ تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا پلنگ لگا ہوا تھا اور باقی دیواروں کے ساتھ بچوں کے چھوٹے، چھوٹے پالنے رکھے تھے۔ ہر پالنے میں بچے سو رہے تھے جن کے صرف چہرے ہی دکھائی

دیتے تھے۔ باقی جسم ڈھانپ رکھے تھے۔

مَیں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن پالنوں کے پاس گیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے، اور پانچوں میں ایک ہی شکل اور عمر کے بچّے سو رہے تھے۔ بچّے بڑے پیارے اور خوبصورت تھے۔ میرے دِل میں اُن کے لیے اچانک پیار نے انگڑائی لی اور مَیں نے اپنا سر جھکا کر ایک بچّے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر مَیں جھٹ پیچھے ہٹ گیا کیوں کہ وہ اصلی بچّہ نہ تھا بلکہ مٹّی کا بنا ہوا بچّہ کا مجسمہ تھا۔ پھر مَیں نے دُوسرے پالنوں کی طرف دھیان دیا، وہاں بھی مٹّی کے مجسمے تھے۔

"سوتے ہوئے بچّے کو پیار نہیں کرتے!" ایک طرف سے اس عورت کی آواز آئی۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سامنے ایک دروازے میں کھڑی تھی۔ دایاں ہاتھ دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا رکھا تھا۔ ساڑھی کس کر لپیٹی ہوئی تھی، اور اُس کا پلّو نیفے میں اُڑس رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ راکھ سے سَنے ہوئے تھے، جیسے وہ برتن مانجھتے مانجھتے یہاں آکر کھڑی ہو گئی ہو۔

مَیں نے اُس کے قریب پہونچ کر اُسے اطلاع دینے کے سے انداز میں کہا۔ "وہ برتن جو تم رکھ آئی تھیں ـــــ بالکل خالی ہیں!"

اُس نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے اندر جاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی اُنہیں بھی صاف کر دیتی ہوں!"

مَیں نے ذرا بلند آواز میں پھر کہا۔ "سُنو تو یہ بچّے نہیں مٹّی کے مجسمے ہیں!"

اُس نے بدستور جاتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔ مَیں نے اُنھیں خود سُلایا تھا۔" وہ اندر چلی گئی، اور میں کافی دیر تک وہاں کھڑا خلا میں گھورتا رہا۔ پھر لوٹ کر اُسی کمرے میں آگیا، جس میں پہلے تھا۔ اب وہاں برتن بھی موجود نہ تھے۔

مَیں دھم سے صوفے پر آکر گرا، اور اپنے ہاتھ مَلتا ہوا کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ مجھے وقت کا بالکل اندازہ نہ ہوا تھا کہ کب تک بے مقصد بیٹھا بور ہوتا رہا۔ پھر وہ اندر والے کمرے سے نکل کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی ـــــ "آؤ چلیں کافی رات ہو گئی ہے!"

مَیں نے سر اُٹھا کر نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، وہ اپنا لباس تبدیل کر کے اور خوب بناؤ سنگار کر کے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر میرے لیے محبّت اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

مَیں اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک پلٹ کر دیکھا۔ تصویر والا مرا ہوا آدمی ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور اُس کی پیشانی پر کچھ شکنیں اُبھر آئی تھیں۔ مَیں ذرا ٹھٹکا۔

میرے ٹھٹکنے سے اس نے بھی پلٹ کر تصویر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا تم میرے مرد سے ملنا چاہتے ہو؟"

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ تو مر چکا ہے!" مَیں نے حیرانی سے کہا۔

"پھر کیا ہوا۔!" اُس نے جواب دیا۔ اور میری کلائی اپنے ہاتھ میں تھام کر مجھے باہر لے گئی ۔ مکان کا برآمدہ عبور کر کے ہم گلی میں آ گئے۔ سب گھروں میں خاموشی تھی اور مکمل اندھیرا۔ آہستہ آہستہ گلی میں چلتے ہوئے ہم بڑی سڑک پر پہونچ گئے۔

"تم نے کہا تھا نہ کہ یہ ساتواں آسمان ہے!" مَیں نے سوال کیا۔

"ہاں! اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"مگر یہ تو شہر ہے اور یہاں مکان ہیں، اور سڑکیں ہیں اور سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے لگے ہوئے ہیں، اور اُن پر قمقمے روشن ہیں جو ہمیں تاریکی میں راستہ سجھاتے ہیں!"

اُس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگی۔ "بُدھو کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آسمان کوئی چیز نہیں ہوتی صرف خلا ہوتا ہے۔ اور ہم اُسے اپنی سہولت کے مطابق نام اور نمبر دے دیتے ہیں!"

مَیں بہت پشیمان ہوا کہ میں زندگی بھر سہولت کے مطابق کسی چیز کو اپنی طرف سے نام نہ دے سکا۔

وہ پھر بولی۔ "ہمارے کچھ سماجی مسائل ہیں۔ تمھیں اُن کا علم ہے۔"

”نہیں!“ میں نے جواب دیا۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے میں ایک لمبے سفر پر تھا۔ پھر میں پلٹ کر گھر آیا اور اپنی ذات کی چار دیواری میں قید ہو گیا۔ مجھے باہر کی کوئی بھنک نہیں پڑی۔ ایک دن نہ جانے کیسے پتہ چلا کہ ویتنام میں جنگ ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ پھر میں نے نقشے پر دیکھا۔ ویتنام کہاں ہے؟ اور جب ویتنام مجھے نقشے میں مل گیا تو میں اس کی تلاش میں نکل پڑا۔

سمندر کے کنارے چلتا چلتا میں ایک دلدل خطۂ زمین تک پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے بچے سے جو ایک پیڑ پر بیٹھا چاقو سے ٹہنی کاٹ کر غلیل بنا رہا تھا، میں نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو، ویتنام کہاں ہے؟“

اُس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سا کنکر نکال کر میری طرف اُچھال دیا۔ کنکر میرے ماتھے پر لگا۔ مجھے چوٹ لگی اور خون بہنے لگا۔ میں نے اپنی پیشانی پر اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں سے سہلایا تو میری اُنگلیاں خون سے لتھڑ گئیں

اُس نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے پُکار کر پوچھا۔ پتہ چل گیا ویتنام کہاں ہے؟“

پھر وہ درخت سے اُترا اور دھیرے دھیرے بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے ماتھے سے خُون بہہ رہا تھا اور پیر دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔

وہ کافی دیر تک میرے چہرے پر دیکھتی رہی۔ پھر بولی بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ آؤ ریستوران سے کچھ کھالیں۔!“

میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ ریستوران پاس ہی تھا۔ ہم دونوں اس میں چلے گئے۔ کافی بڑا ہال تھا۔ کرسیوں اور میزوں کی دو قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ درمیان میں آنے جانے کے لیے کشادہ راستہ تھا جس پر کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ اُس پر کئی قسم کے جانور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کچن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ سب اُداس تھے اور اُنھوں نے سر جھکا رکھے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"ان میں سے اپنی پسند کا جانور چن لو اور اُس پر نشان لگا کر اپنی ٹیبل نمبر لکھ دو، وہ اندر جا کر ذبح ہو کر اور پک کر آجائے گا۔"

"مجھے تو سبھی جانور پسند ہیں۔ نشان دہی والا کام تم کرو۔ مجھے بس بھوک لگی ہے!" مَیں نے جواب دیا۔

پھر معلوم نہیں اُس نے کیسے کیا کیا۔ کہ بھُنے گوشت کی کئی پلیٹیں ہمارے سامنے سج گئیں۔ اور ہم دونوں اُن پر ٹوٹ پڑے۔

"ہاں تو میں تمھیں بتا رہی تھی نا کہ ہمارے کئی سماجی مسائل ہیں!" اُس نے نیپکن سے اپنے ہاتھ اور مونہہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تم نے بتایا تھا!" میں نے ایک بڑی سی ہڈی خالی پلیٹ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمھیں کبھی کسی سماجی مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"شاید! مگر اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ابھی تم ایک مسئلے سے نپٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ!" اُس نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"وہ کیا؟" مَیں نے پوچھا۔

جواب میں اُس نے میز پر چمچ بجا کر بیرے کو بُلایا۔ اور کہا۔ "بِل لاؤ!"

تھوڑی دیر بعد مؤدب طریقے سے بیرا میرے پاس کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوٹی سی طشتری میں اُس نے کاغذ کا ایک پُرزہ بھی تھام رکھا تھا اور اُس کا جھکاؤ میری طرف تھا۔

میں گڑبڑا سا گیا۔ میں نے گردن آگے بڑھا کر اُس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "تم جانتی ہو، جانور سر جھکائے اُداس اپنے آپ اندر جا رہے تھے۔ تم نے اُنھیں منتخب کیا اور وہ ذبح ہو کر اور پک کر ہماری میز پر آگئے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اور تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جب میں تمھارے ساتھ چلا تھا تو میرے رشتہ داروں نے میری تمام جیبیں خالی کروا لی تھیں!"

وہ آہستہ سے ہنسی اور پھر اُس نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر اس میں سے کئی نوٹ نکالے اور

بیرے کی طشتری میں ڈال دیے۔

باہر نکلے تو رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر قمقمے اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ ہمارے اِرد گِرد جو لوگ آ جا رہے تھے، اُن کے چہرے واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

کچھ دُور جا کر اُس نے کہا۔ "ہاں تو مَیں نے کہا تھا نا کہ ہمارے کچھ سماجی مسائل ہیں!"

"ہاں۔ تم نے کہا تھا!" مَیں نے جواب دیا۔

"تو یہ چابی لو اور گھر جاؤ، مَیں صبح آ جاؤں گی۔ اور ہاں ذرا بچّوں کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ بے چارے بھوک سے بلک بلک کر ہلکان ہو جائیں۔!" اُس نے چابیوں کا گچھا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"مگر تم کہاں جا رہی ہو؟" مَیں نے چابی ہاتھ میں لے کر اور تمام ہدایتیں سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"او، ہو تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ سماجی مسائل ہیں اور ہم انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔" اُس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف چل دی۔

مَیں کچھ دیر تو وہیں سڑک کے بیچ میں کھڑا رہا، پھر سر جھکائے کچھ مغموم سا گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہونچ کر بھی یہ سوچنے لگا کہ یہاں اکیلا کیسے پہنچ گیا۔؟

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ تصویر والے مرے ہوئے آدمی نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ چاندی کے گلدان میں مور کے پنکھ ناچے اور سونے کی ننھی چڑیا نے ۵۴ ویں موتی پر جھپٹا مارا۔

مَیں گُم صُم اُن سب کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اندر والے کمرے سے بچّوں کے رونے کی آواز آئی۔ مَیں اُٹھ کر اندر گیا۔ پانچوں بچّے ننھی ننھی باہیں ہلاتے ہوئے رو رہے تھے اور دُودھ کے لیے اُن کی زبانیں ہونٹوں تک آ کر پھر اندر مونہہ میں چلی جاتی تھیں۔

میں بہت پریشان ہوا۔ اُنھیں چُپ کرانے کے لیے میں نے وہی لوری لگائی جو وہ بے نام عورت گایا کرتی تھی مگر وہ پھر بھی چُپ نہ ہوئے۔ آخر ہار کر میں نے اپنی قمیص کا پلّو پتلون میں سے باہر نکالا اور اُوپر اُٹھا کر چھاتی ننگی کر کے اُن کے پالنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ باری باری اُٹھ اُٹھ کر میری چھاتیوں سے دُودھ پیتے رہے اور پھر سو گئے۔

صبح سویرے، مونہہ اندھیرے وہ واپس آگئی۔ میں پالنوں کے پاس ہی فرش پر سویا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے اُٹھایا اور پھر پاس ہی بچھے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مَیں نے دیکھا اس کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے اور چہرے کے سنگار کا رنگ فق تھا۔

اُس نے اپنے وینٹی بیگ میں سے وہ تمام نوٹ نِکال کر گننے شروع کیے جو اُس نے رات ریستوران میں بِل چُکانے کے لیے دیے تھے۔

وہ کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے سگریٹ طلب کیا۔ مَیں نے سگریٹ نکال کر دیا۔ اور پھر ماچس جلا کر اُس کا سگریٹ سلگواتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سماجی مسائل کیا حل ہو گئے؟"

"نہیں ابھی نہیں!" اُس نے جواب دیا۔ آؤ دوسرے کمرے میں چل کر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

مَیں اُٹھ کر اُس کے پیچھے چل دیا اور ہم دُوسرے کمرے میں پہونچ گئے۔

"تم ذرا غور سے اب اس تصویر کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا واقعی میرا مرد مَر چُکا ہے۔" اُس نے اپنے خاوند کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مَیں نے اُس مَرے ہوئے آدمی کی تصویر کی طرف غور سے دیکھا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ کارنس پر جو تصویر رکھی تھی۔ وہ میری ہی تھی۔ مَیں دَم بخود کبھی اُسے اور کبھی اُس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کڑک... کڑاک... کڑک" چڑیا بدستور موتی چُگ رہی تھی۔

”بتاؤنا! یہ آدمی مرا ہوا ہے یا زندہ؟ اُس نے مجھ سے پھر سوال کیا۔ اور سگریٹ کا دُھواں میرے چہرے پر بکھیر دیا۔

مَیں عجیب جھنجھلاہٹ میں تھا۔ کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر نہ جانے کیسے میرے مونہہ سے آپ ہی آپ نکل گیا۔

”یہ آدمی مر چُکا ہے۔!“

اُس نے میرا جواب سُنا اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی دُوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ جہاں اب بچّوں نے جاگ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

کرشن چندر

متّی

ملزم کے خلاف الزام یہ ہے کہ اس نے ۲۹ر جون کی رات میں گابالین میں کھڑی چھ موٹروں کے ٹائر پھاڑ ڈالے۔

میں گابالین کے نکڑ پر رہتا ہوں اور اوپر کی منزل کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر دُنیا کا تماشہ دیکھا کرتا ہوں۔ جب عمر ساٹھ برس سے اوپر ہو جائے تو پھر خود کچھ کرنے کو نہیں رہتا۔ پاںجامے کے اوپر بنیان پہنے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دھیرے دھیرے ہاتھ جُھلاتے ہوئے گذرتی بہتی دُنیا کو دیکھنے میں مزا آتا ہے۔ نکڑ والے اس بنگلے کی مشرقی سڑک ایئرپورٹ کو جاتی ہے۔ مغربی سمت ایڈورڈ ایونیو کے بنگلے ہیں۔ جن کے آخر میں عیسائی راہباؤں کا کانونٹ ہے۔ نکڑ کے مخالف سمت یعنی گابالین کے دوسرے سرے پر ایک بے حد بانکی چھریری خوجن اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اور تین بچوں کے باوجود بے حد خوبصورت ہے۔ بال کٹے ہوئے ہیں لہرا کر چلتی ہے۔ جیسے وہ اپنے آپ کو عورت نہیں بادِ نسیم کا جھونکا سمجھتی ہو۔ پہلے تو وہ میری تاک جھانک سے بدکتی تھی مگر اب میرے اور اس کے درمیان ایک خاموش مفاہمت سی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ میری کھڑکی کے قریب آ کر دو ایک لمحوں کے لیے

رک کر دیکھتی ہے۔ پھر ایک عجیب ادا سے مجھے اپنا رُخ دکھا کر بریدہ گیسو جھلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

خوجن کے گھر کے سامنے ایک مشہور پاپ سنگر رہتا ہے۔ اس کی دو بہنیں ہیں جون اور مارتھا۔ مارتھا نام رکھنے والی لڑکی کو میں نے آج تک پسند نہیں کیا۔ ایک صرف اسی مارتھا کو کیا کہیے۔ میں نے آج تک جتنی مارتھائیں دیکھی ہیں سبھی کو معمولی شکل وصورت کا پایا ہے۔ مگر دل بے حد گداز ہوتا ہے ان کا۔ اور بے حد شوہر پرست اور بچوں پر جان چھڑکنے والی مائیں ہوتی ہیں۔ جون کو البتّہ میں پسند کرتا ہوں۔ خوبصورت تو نہیں ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ خوبصورت بنتے بنتے رہ گئی ہے۔ ہاں اتوار کو جب گرجا کے لیے سج سنور کر جاتی ہے تو خاص دلکش معلوم ہوتی ہے۔ جانے کیا بات ہے سجنے سنورنے سے عورت کا رنگ رُوپ نکھر آتا ہے۔ مرد پہلے سے زیادہ بدصورت ہو جاتا ہے۔

خوجن سے تو علیک سلیک بھی نہیں ہے۔ مگر جون سے ہے۔ ایک روز میں ٹیکسی میں آموں کی ٹوکری لا رہا تھا۔ بنگلے کے آہنی گیٹ پر جب ٹیکسی روک کر میں نے آموں کی ٹوکری کو اُٹھانا چاہا تو ٹوکری میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر اُلٹ گئی۔ اور بہت سے آم اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے۔ کم بخت ٹیکسی ڈرائیور نے ذرا بھی مدد نہ کی۔ مزے سے ٹیکسی میں بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔ مجھے اس قدر غصّہ آیا کہ میں نے جیب سے چُھرا نکال کر اسے وہیں جان سے مار دیا۔ یعنی خیال ہی خیال میں اب تک میں درجنوں قتل کر چکا ہوں اور جس طرح مزا اس قسم کے قتل میں ہے وہ اصل قتل میں بھی کیا ہوتا ہوگا۔ پھر نہ کورٹ جانا پڑتا ہے نہ مقدمہ چلتا ہے۔ نہ سزا ہوتی ہے۔ نہ لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ نہ ضمیر سرزنش کرتا ہے۔ چُھری اُٹھاؤ۔ قتل کرو۔ پھر مزے سے اس چُھری کو صاف کر کے اسی سے آم کاٹ کے کھاؤ۔

چنانچہ جب اس خیالی چُھری سے ٹیکسی ڈرائیور کو ہلاک کر کے میں سڑک پر لڑھکتے ہوئے آم اکٹھے کرنے لگا تو جون کہیں سے آگئی۔ اس نے آکر پہلے تو ٹیکسی ڈرائیور کو ڈانٹا

پھر میرے ساتھ لگ کر آم اکھٹے کر کے میری ٹوکری میں ڈالنے لگی۔ جون کی رنگت میرے آموں کی طرح سنہری ہے اور بڑی بڑی سیاہ پلکیں اس کی آنکھوں کی جھیلوں پر سایہ کئے ہوئے دور کنپٹی تک چلی گئی ہیں۔ پلکیں نقلی ہیں تو کیا ہوا۔ رنگت میک اپ سے بدلی ہے تو کیا ہوا۔ لگتی تو اچھی ہے۔ اور سڑک سے آم اٹھاتے اٹھاتے اس کے اوپر کے ہونٹ پر پسینے کی بوندنیاں نمودار ہو چلی ہیں۔ بہت پیاری لگتی ہے۔ آم ٹوکری میں جمع کر کے چلی جائے گی تو کیا ــــ ایک دن جانا سب کو ہے۔ لیکن اس خوبصورت لمحے کو میں نے ایک خوش رنگ تتلی کی طرح پکڑ کر اپنی زندگی کی کتاب میں رکھ لیا ہے۔ جب بھی یہ صفحہ کھولوں گا اس تتلی کے رنگ میری آنکھوں میں تھرتھرائیں گے۔ اور آم کی خوشبو سے میرے سارے احساس بھر جائیں گے۔

دو برس ہو گئے اس واقعہ کو وہ جب بھی مجھے ملتی ہے "ہیلو انکل" کہتی ہے۔ میں کہتا ہوں ہیلو جون یعنی انکل کہہ کر اس نے مجھ سے اپنا فاصلہ برقرار رکھا ہے۔ میں جون کہہ کر اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہوں اور یوں ہی یہ کشمکش چلتی رہے گی۔ سوچتا ہوں ایک روز ایر پورٹ جا کر اپنے تینوں لڑکے جو ولایت میں پڑھتے ہیں، جمع کر کے ٹیکسی میں بھر لاؤں گا۔ گھر کے آہنی گیٹ کے باہر جب ٹیکسی رُکے گی تو تینوں لڑکے ٹیکسی سے آموں کی طرح لڑھک پڑیں گے۔ اور جون کہیں سے آتی ہوئی ان میں سے کسی ایک کو چُن لے گی۔ اور اس کے ساتھ گرجا چلی جائے گی۔ جون بے حد قدامت پرست شریف لڑکی ہے۔ وہ ہر اتوار کو اپنے بوائے فرینڈ نہیں بدلتی ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے جا کر بدلتی ہے۔ اور اپنے بوائے فرینڈ کے سامنے مجھے ذلیل نہیں کرتی ہے۔ یعنی انکل نہیں کہتی ہے۔ صرف اکیلے میں کہتی ہے دوسرے ہوں تو بس چور نظر سے دیکھ کر خاموشی سے گذر جاتی ہے۔ اس کی خاموشی نئے کپڑوں میں بسی ہوئی مہک کی طرح میرے نتھنوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس کا ہیلو کہنا مجھے اتنا اچھا نہیں لگتا جتنا ہیلو نہ کہنا ــــ کیونکہ کبھی کبھی نہ کہنے کی

بلاغت کہہ دینے کی فصاحت سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

خوجن کے شوہر کے پاس ایک گاڑی ہے ایک ٹمپو اور ایک لاری۔ ٹمپو اور لاری وہ کرائے پر دیتا ہے۔ اور گاڑی بالعموم اس کی بانکی خوجن چلاتی ہے۔ اور آلو یا پیاز تک کے لیے اس کی گاڑی مارکیٹ تک لے جاتی ہے۔ خوجے کو میں اکثر اپنی طرح بس میں جاتے دیکھتا ہوں۔ اب میرے پاس بھی اگر گاڑی ہوتی تو میں گرے ہوئے آم کی طرح سڑک پر نہ لڑھکتا ہوتا۔ خود عورتیں ہمک کر میری گاڑی میں آبیٹھتیں۔ ہمارے سماج کا الجبرا ہی کچھ اس قسم کا ہے۔ گاڑی کو عورت سے ضرب دو تو مرد کی عمر آدھی ہو جاتی ہے۔

جون اور مارتھا کا بھائی جو مشہور پاپ سنگر ہے اور اکثر شام کو اپنی کوٹھی کی چھت کی مُنڈیر پر ٹانگیں پھیلائے گٹار کو گود میں لیے گاتا نظر آتا ہے اس کے پاس بھی زرد رنگ کی لوہاک کی گاڑی ہے۔ یہ گاڑی بھی سٹائیلش ہے۔ اور اسے دیکھ کر آج کل کی زرد دھاری والی پتلون کا خیال آتا ہے۔ جو ہندوستانی ہپیوں میں بہت پاپولر ہے۔

مارسیا کے پاس زینڈا گاڑی ہے۔ اسے مارسیا کے پاس آئے ہوئے اتنے ہی سال ہو گئے جتنے سال مارسیا کے شوہر کو مرے ہوئے ہو گئے۔ زینڈا کو مارسیا کا شوہر انگلینڈ سے لایا تھا۔ اس کا عہدہ چیف انجینئر کا تھا۔ رونڈا ڈیم کی تعمیر میں ڈائنامیٹ کا ایک فلیتہ بے وقت پھٹ جانے سے اس کی موت ہو گئی۔ تین برس کا ایک بچہ چھوڑ کے وہ مارسیا کو داغِ مفارقت دیکر چلا کر۔ گھر کا امیر تھا اس لیے گا بالین کا سب سے خوبصورت گھر مارسیا کو دیکر چلا گیا۔ ہماری طرح کا دو منزلہ بنگلہ ہے۔ اُوپر کی منزل میں مسٹر اور مسز ایلش وڈو ہتے ہیں یہ اینگلو انڈین جوڑا ادھیڑ عمر کا ہے۔ بامیلا ایلش وڈ کسی زمانہ میں بڑی حسین ہوگی۔ اب بھی اس کی آنکھیں مُسکراتی ہیں ایسی گہری سمجھ ہے ان میں جو دس پندرہ عاشق رکھنے کے بعد ہی عورت کی نگاہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم دونوں شام کے جھٹپٹے میں اکثر سڑک پر چلتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر اکثر رُک جاتی ہے۔ جاسوسی ناول ہم

دونوں پسند کرتے ہیں۔ اس لیے گفتگو کا موضوع اگاتھا کرسٹی یا اینڈرسن جونز یا اس راس میکڈانلڈ ہوتے ہیں۔ پامیلا سگریٹ بے تحاشہ پیتی ہے۔ اور اپنی امباسیڈر بے تحاشہ تیز چلاتی ہے۔ ممکن ہے شوہر سے جھگڑا رہتا ہو۔ کیونکہ وہ اور ڈیوڈ بہت ہی کم اکٹھے دیکھے جاتے ہیں۔ دو ایک دفعہ مجھے اس کا سگریٹ سلگانے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔

مگر مارسیا کی بات اور ہے۔ مارسیا تو گا بالین کا گلاب ہے۔ دو چار سال تو بیچاری نے ایک وفادار بیوی کی طرح کسی نہ کسی طرح رو دھو کر بسر کر دئے۔ صرف بیویاں ہی نہیں بیوائیں بھی وفادار ہوتی ہیں اور ہندوستان میں تو انھیں دم آخر تک اپنے مرے ہوئے شوہر کی یاد کو سینے سے لگائے وفادار رہنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ گو اب حالات بدل رہے ہیں یہ وہ زمانہ ہے جب یادیں دھندلی پڑنے لگی ہیں اور جسم کی مانگیں ابھرنے لگی ہیں۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ بعض اوقات نوجوان بیوائیں نوجوان بیویوں سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔ مارسیا کو دیکھ کر اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ حسن سوگوار میں حسن خوشگوار سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔

پہلے سال تو مارسیا بالکل سیاہ ملبوس میں رہی۔ دوسرے سال سے کپڑوں کی تراش بدلنے لگی اور کپڑوں کے رنگ بھی، وہ چمکیلے رنگ تو نہیں آئے جو اس کے جوان جسم پر پھبتے لیکن ہاں سنجیدہ رنگ اور ڈیزائن سیاہ رنگ کی جگہ لینے لگے۔ تین چار سال کے بعد وہ بالکل ماڈرن ڈیزائن اور ماڈرن رنگوں پر آ گئی۔ کبھی کبھی عورت کے کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن دیکھ کر اس کی نفسیاتی کیفیت اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ مارسیا کے کپڑے دیکھ کر لگتا ہے اب وہ کھل کھلنے پر آمادہ ہے۔ اپنے بنگلے کی دیوار پر پھیلی ہوئی بوگن ویلیا کے نیچے دھندلی بھیگی شاموں میں اسے میں نے کئی بار بے قرار دیکھا ہے۔ کئی بار کسی سے لپٹ کر ہم کنار دیکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں مارسیا کو اپنے مرحوم خاوند سے بڑی محبت تھی۔ مگر کسی جوان جسم کو کب تک کسی کی مری ہوئی یاد سے آسودہ رکھا جا سکتا ہے۔ اب مارسیا ایک نیا شوہر

چاہتی ہے۔ وہ اکثر اپنی زینڈا میں کسی کورٹ شپ کے لیے آنے والے مرد کے ساتھ گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بوائے فرینڈ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کی گاڑی کا رنگ بھی سال میں دو مرتبہ بدلتا ہے۔ جونہی اس کی گاڑی کا رنگ بدلا میں سمجھ جاتا ہوں اب اس کا بوائے فرینڈ بھی بدلے گا۔

گابالین میں اپر مڈل کلاس رہتی ہے۔ دو ایک کو چھوڑ کر سب کے پاس اپنے بنگلے ہیں۔ اپنی گاڑیاں ہیں۔ اپنی مطمئن مغرور زندگی ہے۔ گابالین میں دو ایک کو چھوڑ کے سبھی کرسچین رہتے ہیں۔ ہر گھر میں پیانو ہے اور مغربی موسیقی کا شوق ہے۔ مغرب سے آئے ہوئے فیشن سب سے پہلے گابالین اور ایڈورڈ ڈلبر ینیو میں نمودار ہوتے ہیں لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومتی ہیں۔ مرد اپنی محبوباؤں کے ساتھ۔ میں کھڑکی میں کھڑا دیکھتا ہوں۔

مگر کچھ دنوں سے اس طمانیت اور فراغت بھری زندگی میں غریبی گھس آئی ہے۔ کوئی بیس پچیس مزدور میونسپل کمیٹی کی طرف سے مامور کئے گئے ہیں۔ گابالین کے دونوں طرف کنکریٹ کے ڈرین پائپ ڈالنے کے لیے ان لوگوں نے میری کھڑکی کے بالکل سامنے سڑک کے اس پار بڈھے پارکر کے بنگلے کے باغیچے کی باڑھ سے لگ کر چھ چھپر باندھ لیے ہیں۔ لگتا ہے گابالین کا ایک حصّہ سلم میں بدل گیا ہے۔ کالے کالے ننگے بدن نیکر اور پھٹی ہوئی بنیان پہنے ہوئے کدال سے زمین کھودتے رہتے ہیں چٹائی کے چھپروں میں کھانا پکاتے ہیں۔ دو چھپر پرانی زنگ آلود ٹین کے پتروں سے بنے ہیں ایک میں تو دروازہ بھی ہے اور اس پر کبھی کبھی تالا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ اس ٹین کے چھپر میں سیمنٹ کے بورے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے قریب آٹھ بڑے بڑے لوہے کے ڈرم پانی سے بھرے رکھے ہوئے ہیں۔ یہی پانی سیمنٹ ریت اور بجری ملانے کے کام آتا ہے۔ اسی پانی میں مزدور نہاتے ہیں اسی پانی کو وہ پیتے ہیں۔ ہر روز صبح پانی سے بھری ہوئی ایک

لاری آتی ہے۔ اور ڈرم بھر جاتی ہے۔ رات کو کھلے چھپروں میں یہی مزدور چولھے پر رکھ کر روٹی پکاتے ہیں کھانا کھا کے اسی جھلملاتی روشنی میں جس میں تاریکی زیادہ ہوتی ہے۔ اور روشنی کم ہوتی ہے وہ ہجر و فراق کے گیت گاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بیویاں ان کے گاؤں میں ہیں اور وہ اپنے گاؤں سے سیکڑوں میل دور گابالین کی پکی سڑک کے دورویہ ڈرین پائپ کے کیڑے ہیں۔ ہم لوگوں کو بہت برا لگتا ہے۔ گابالین کے افق پر دور دور تک ایسی بدصورتی اور غریبی نہ تھی۔ لگتا ہے اب تک اخباروں میں جو پڑھتے تھے دن رات ایکا ایک وہ پرابلم ہمارے سامنے آگیا ہے۔ مگر ہمارا اس پرابلم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہت عرصہ ہوا ہم لوگ اپنے لیے اس پرابلم کو حل کر کے گابالین میں آ کر بس گئے تھے۔ ہمیں کیوں تنگ کیا جا رہا ہے۔ کوئی آٹھ دس دن کی بات ہے تو آدمی دانت بھینچ کر آنکھ بند کر کے گزار دے مگر یہ لوگ تو سنا ہے چار مہینے تک یہاں رہیں گے۔ اور نہ صرف گابالین بلکہ ایڈورڈ ایونیو کی دونوں گلیوں میں کنکریٹ کے پائپ ڈالیں گے۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ راتوں رات نالیاں کھد جائیں۔ سیمنٹ کے بستر بن جائیں اور ان میں کنکریٹ کے پائپ جما دیے جائیں۔ سائنس کی دنیا میں کیا ممکن نہیں ہے۔ مگر میونسپل کمیٹی ہمیں تنگ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ پانچ روپے یومیہ مزدوری پانے والے مزدور جانے کہاں سے ایک کانٹے دار جھاڑی کی طرح ہمارے باغیچے میں اگ آئے ہیں۔ یہ لوگ ہماری گابالین کی خوبصورت زندگی میں ایک بدنما دھبے کی طرح ابھر آئے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ناک سکوڑ کر ان کے قریب سے کترا کر نکل جاتے ہیں جن کے پاس گاڑیاں ہیں وہ اس ٹکڑے سے جلدی سے نکل جاتے ہیں۔ مگر ان مزدوروں کو ہماری زندگی سے کوئی علاقہ نہیں، ہماری رائے کی کوئی پروا نہیں جیسے یہ لوگ کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوئے ہوں۔ یہ لوگ آپس میں چہلیں کرتے ہیں ہنستے ہیں گیت گاتے ہیں کام کرتے ہوئے گیت گاتے ہیں۔ دال بھات یا دال روٹی کھا کر اپنے چھپر میں یا سڑک کے کنارے لیٹے ہوئے بڑے بڑے ڈرین پائپ کے اندر بڑے مزے سے سو جاتے ہیں۔ امیر

لوگوں کو ہر دم خیال رہتا ہے کہ وہ امیر ہیں لیکن ان غریب لوگوں کو کبھی خیال نہیں آتا کہ وہ غریب ہیں۔ ان کے ہنستے بشاش چہرے اور تندرست جسم دیکھ کر خیال آتا ہے۔ شاید ان لوگوں نے کوئی ایسی امیری ڈھونڈ لی ہے جسے پیسے کی حاجت نہیں۔

چند دنوں سے ان مزدوروں میں ایک لڑکی شامل ہوگئی ہے۔ گہرا سیاہ رنگ بٹن ایسی چمکتی ہوئی آنکھیں اور ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ اور صاف ستھرے ہاتھ پاؤں میں اسے اکثر ایک چڈی پہنے پانی کے بڑے ڈرم کے قریب نہاتے دیکھتا ہوں بال اکثر کھلے ہوتے ہیں۔ کبھی سُلجھی پھول دار کاٹن کا ایک چیتھڑا اس میں بندھا ہوتا ہے۔ نہاکر وہ اکثر سڑک پر بیٹھ کر پتھر کے ٹکڑے جمع کرنے لگتی ہے کبھی مادر زاد ننگی ہوکر ناچنے لگتی ہے۔ نہیں نہیں وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ محض تین سال کی ایک بچی ہے۔ اس کا نام متّی ہے اور اس کے مزدور باپ کا نام گھولو ہے۔ گھولو بالکل ایک نوجوان سا لڑکا ہے۔ تین سال ہوئے اس کی بیوی نمونیا سے مرگئی۔ متّی کو اس کی بیوی کی بڑی بہن نے پالا ہے۔ جو سولہویں روڈ پر تعمیر ہونے والی یونائیٹڈ بلڈنگ میں کام کرتی ہے۔ مگر گھولو اپنی بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکا اس لیے اب وہ اسے یہاں لے آیا ہے۔

مجھے منی بہت بھاتی ہے۔ کھڑکی میں سے اسے اکثر دیکھتا ہوں۔ اسے نہانے کا بھی بے حد شوق ہے۔ بھرے ہوئے ڈرم میں سے اپنی چھوٹی سی لٹیا میں پانی لےکر نہاتی رہتی ہے۔ نہاکر پھر سڑک پر کھیلتے ہوئے خاک میں لوٹتے ہوئے اتنی ہی گندی ہوجاتی ہے مگر اسے اس کا کوئی احساس نہیں ہے۔ سڑک کی خاک اس کے لیے گھاس کی لان کے برابر ہے یا کسی عمدہ باغیچے کی طرح۔ شروع شروع میں مجھے اس کا عریاں رہنا بہت کھلا۔ مَیں اس کے لیے ایک دن دو چڈیاں لے آیا۔ پھر ایک فراک لایا۔ پھر مٹھائی لایا۔ پھر بالوں کے لیے ربن لایا۔ بڑی مشکل سے وہ کافرادا دام ہوئی ہے پہلے پہل وہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی تھی مجھے دیکھ کر چھپّر میں چھپ جاتی تھی۔ اور چھپر

کے دروازے کی آڑ سے جھانک کر مجھے دیکھتی تھی۔ بات تو اب بھی وہ مجھ سے نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ منی ہندی نہیں جانتی گھولو مدھیہ پردیش کا قبائلی ہے۔ گھولو شہروں میں رہ کر ہماری بولی سیکھتا ہے۔ مگر متّی تو ابھی تین سال کی ہے میری اور اس کی گفتگو اس کے باپ کے ذریعے ہوتی ہے یا اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ذریعے یا اس کی گردن کی جنبش کے ذریعے جس سے وہ ہاں یا ناں کرتی ہے مگر دھیرے دھیرے وہ میری محبت کی رشوت کی قائل ہوتی جارہی ہے اس نے طے کر لیا ہے کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف مجھ سے۔ دو نئے فراک ایک نئی چڈی چند ربن اور کچھ پیسے جو میں اسے دیتا ہوں اس نے الگ ایک پوٹلی میں باندھ کر رکھ دیے ہیں۔ کہتی ہے یہ میرا جہیز ہے۔ کبھی تو ہمک کر میری گود میں آجاتی ہے۔ کبھی اُنگلی پکڑ کر میرے ساتھ ساتھ سڑک پر چند قدم چلتی ہے۔ پھر جہاں پانی کے ڈرم رکھے ہیں وہاں جاکر رک جاتی ہے۔ اور مجھے بازار سے کھلونے لانے کی فرمائش کرتی ہے۔ اب اس کے پاس لکڑی کا گھوڑا ہے کپڑے کا خرگوش ہے بھالو ہے اور ایک بہت پیاری گڑیا ہے اور پلاسٹک کا ایک ببوا ہے جسے وہ اکثر اپنے ساتھ نہلاتی ہے اور نہلا کر اسے اپنی کمر کے خم میں لٹکا کر بڑی بوڑھیوں کی طرح چلتی ہے۔

میری اولاد میں صرف لڑکے ہی لڑکے ہوئے لڑکی کوئی نہ ہوئی۔ پر اب متّی کے آجانے سے لگتا ہے جیسے وہ کمی پوری ہوگئی مگر گابالین والے میری اور متّی کی دوستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ انھوں نے میرے گھر والوں کو سمجھایا اور میرے گھر والوں نے مجھے سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا مجھ پر۔ میں متّی کے اور منی میرے بہت نزدیک آتے گئے۔ مَیں نے منی سے کہہ دیا ہے کہ ہم شادی تو کریں گے ہی مگر وہ بار بار پوچھتی ہے ”کب میں جواب دیتا ہوں ”جب اس سڑک کے دونوں طرف ڈرین پائپ لگ جائیں گے۔ مگر ایک پائپ ہم رکھ لیں گے اپنے رہنے کے لیے۔ ورنہ ہم سوئیں گے کہاں۔ متّی کو چھپّر کی زندگی پسند نہیں ہے۔ اسے کنکریٹ کا ڈرین پائپ زیادہ پسند ہے۔ صاف ستھرا ہے دو طرف سے کھلا ہے۔ متّی کو اس میں کھیلنا بہت پسند ہے۔

جب سے میں نے اسے لوہے کے ٹب میں پھنسا ہوا لال رنگ کا لنگور لا دیا ہے۔ وہ اسے اکثر ٹب کو پائپ میں پھنسا کر لنگور کو ڈوری سے اوپر نیچے پھلانگتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

ایک روز جب بنارسی مٹھائی والے سے متی کے لیے تھوڑی سی مٹھائی لے کر چلا آرہا تھا تو نکڑ پر متی مجھے دیکھ کر دونوں باہیں پھیلا کر بے تحاشہ کلکاریاں مارتی ہوئی خوشی سے دوڑتی ہوئی میری طرف بھاگی۔ سڑک کراس کرتے ہوئے اسے آس پاس کا کوئی دھیان نہ رہا اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں صرف مجھے دیکھ رہی تھیں۔

ہیں اسی وقت نکڑ سے ایک تیز ٹرن کاٹتی ہوئی مارسیا کی موٹر سب وے Sub-way) سے آکر اس کے گھر کی طرف نکل گئی دوسرے لمحے میں میرے منہ سے زور کی ایک چیخ نکلی کیونکہ متی مارسیا کے موٹر کے نیچے آ چکی تھی۔ جسے مارسیا کا نیا بوائے فرینڈ چلا رہا تھا۔ وہ یونائیٹڈ کنگڈم سے بیس روز کی چھٹی پر آیا تھا اور چند دن کے بعد مارسیا کو انگلینڈ لے جانے والا تھا جہاں اس کا اور مارسیا کا فائینل کورٹ شپ ہونے والا تھا۔ مارسیا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے بوائے فرینڈ نے موٹر سے اتر ان ان پڑھ جاہل گندے غلیظ مزدوروں کو ہزاروں گالیاں سنا ڈالیں جو اپنے بچوں کو سڑک پر ننگ دھڑنگ ناچنے گانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

میں نے اور گھولو نے اور مزدوروں نے مل ملا کر متی کو موٹر کے نیچے سے نکالا۔ مگر وہ مر چکی تھی۔

ہم لوگ متی کو دفن کر آئے ہیں۔

گا بالین میں سناٹا ہے آج کسی چھپر میں چولہا نہیں جلا۔ سب مزدور گھولو کے گرد جمع ہیں جو اپنا منہ بازوؤں میں چھپائے چپ چاپ لیٹا ہے ڈرین پائپ میں لٹکا ہوا لنگور اکیلا ہے اور متی کی گڑیا چھپر کے ایک کونے میں الٹی پڑی ہے وہ لوگ اس سے بات کرنا چاہتے ہیں مگر گھولو کسی سے بات نہیں کرتا وہ چپ چاپ لیٹا ہے۔

میں نے ایک مزدور کو چھ روپے دیئے "اسے شراب پلاؤ اس سے باتیں کرو اسے بہکنے دو۔ ورنہ یہ بھی جان سے چلا جائے گا غم زدہ گھولو۔"

مارسیا کے بنگلے کی کھڑکیاں کسی مجرم کے ضمیر کی طرح اندر سے بند ہیں۔ لین میں آنے والے نکّڑ کے قریب سر جھکائے گذر جاتے ہیں۔ رات گہری ہوتی جاتی ہے۔ غم زدہ گھولو کے سینے میں سسکیاں بھری ہیں مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلتی وہ اسے شراب پلاتے ہیں وہ چپکے چپکے پیتا جاتا ہے۔

پھر ایک مزدور نے گھولو کے سامنے منی کی پوٹلی رکھ دی گھولو نے اسے دھیرے دھیرے سے کھولا نہ اس کی آنکھ نم ہے نہ ہاتھ کانپتے ہیں وہ ایک ایک چیز الگ کرتا ہے اودے پھُولوں والا فراک بادامی ریشم کا فراک۔ لال چڈی ہری چڈی ہاتھوں سے تالی بجانے والا بھالو لمبے لمبے کانوں والا خرگوش، سونے کے پالش والا جھمکا۔

ایکاایک وہ ایک زوردار چیخ کے ساتھ اُٹھا اور اُٹھتے ہی اس نے چھپّر کی آہنی دیوار سے لوہے کا ایک پترا کھینچ لیا اور اسے ہاتھ میں لے کر بجلی کی سی تیزی سے ——— باہر نِکل گیا۔

ملزم کے خلاف الزام یہ ہے کہ اس نے ۲۹؍ جون کی رات میں گابالین میں کھڑی چھ موٹروں کے ٹائر پھاڑ ڈالے۔

عصمت چغتائی

ڈھکوسلا

جے ہند کالج کے سامنے کیسی بے پناہ بھیڑ جمع ہے۔ کوئی ایکسی ڈینٹ ہوگیا۔ یا کسی نئے فلم کا پریمیر ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے غول چلے آرہے ہیں۔ سڑک پر موٹروں کی دوہری قطاریں کھڑی ہیں۔ اوہو آج داخلے کی تاریخ ہے۔ لا کالج پر بھی ایسی ہی بھیڑ ہے۔ کے سی کالج کے سامنے بھی طلبا کے ٹھٹ جمع ہیں۔

بچے کس ذوق وشوق سے داخلہ لینے پر جُٹے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں۔ ایک کالج سے دوسرے کالج کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ والدین کئی دن سے منسٹروں اور عہدیداروں کے ٹیلی فون کھڑکھڑا رہے ہیں۔ جن جن کے مسکے لگائے تھے، دعوتیں دی تھیں ولایت کے اسمگل کئے ہوئے تحفے دئے تھے، آج ان سے وصولی کا وقت آگیا ہے۔ سب اپنے اپنے پشت پناہوں کی چٹھیاں لیے رجسٹرار کے دروازے پر آس لگائے کھڑے ہیں۔ کبھی کوئی پروفیسر نما شخص اِدھر سے اُدھر گذر جاتا ہے تو سب با ادب با ملاحظہ اٹینشن ہوجاتے ہیں۔ بڑی عقیدت سے سلام کرتے ہیں وہ نہایت رعونت سے سر کو ایک شاہانہ جنبش دے کر گذر جاتا ہے جیسے وہ تقدیر کا فرشتہ ہو اور اس کی مٹھی میں ان نوجوانوں کا مستقبل ہو۔ دو چار بڑھ کر اسے گھیر لیتے ہیں۔

سرپلیز ... ."

"یس" وہ بڑی رعونت سے پوچھتا ہے جیسے غریب کو بالکل خبر نہیں کہ وہ کس لیے یہاں آئے ہیں۔

"رجسٹرار کا دفتر کب کھلے گا"۔ بڑی انکساری سے پوچھتے ہیں۔

"کھلے گا کھلے گا"۔ وہ سر ہلاتا گذر جاتا ہے۔

کیسے کیسے پاپڑ بیل کر تو کالج تک پہنچنے کا وقت نصیب ہوا۔ چار چار ماسٹروں سے ٹیوشن لی۔ سیروں گذشتہ سالوں کے پیپر خریدے، خدا خدا کر کے پاس ہوئے اسکول سے جان چھوٹی۔ اب کالج میں اعلیٰ تعلیم پانے کا نایاب موقع ہاتھ آیا۔ مگر داخلہ ملنا مذاق نہیں۔

حصول علم کا نشہ سوار ہے۔ ہر طالب علم داخلہ لینے کے لیے بے قرار ہے۔ کتنا شوق ہے ان کے دلوں میں، علم حاصل کر کے یہ ایک دن اپنے ملک کا نصیب جگائیں گے۔ اس کے رُخ پر جمی ہوئی پھٹکار دُور کریں گے۔ ڈاکٹر بن کر بیماریوں سے جنگ کریں گے۔ انجنیئر ملک سے تاریکی دور کریں گے، موٹریں، ہوائی جہاز، ٹیلی وژن بنائیں گے اور ایک دن چاند پر جائیں گے۔ داخلہ کی ہما ہمی ختم ہو گئی۔ کالج میں کیسا سناٹا ہے۔ کس قدر خاموشی سے مطالعہ میں مشغول ہیں۔ شروع میں چند ہفتے تو بڑا ہنگامہ رہا اب شاید جم گئے ہیں۔ مگر یہ مطالعہ کہاں جا رہا ہے۔ کلاسیں تو آدھی خالی ہیں۔

ایروز سینما پر گیارہ بجے کی شو پر کس غضب کی بھیڑ ہے باہر "ہاؤس فل" کا بورڈ لگا ہے۔ مگر بلیک سے ٹکٹ ملنے کی اُمید میں بے چین کھڑے ہیں۔ نااُمید ہو کر بیچارے "نیو ایمپائر" یا اسٹرلنگ کی طرف ٹیکسیاں لے کر بھاگتے ہیں۔ ورنہ گرانٹ روڈ اور لیمنگٹن روڈ پر تو ٹکٹ مل ہی جاتے ہیں۔

سینما دیکھ کر نکلتے ہیں تو لنچ کا وقت ہو جاتا ہے۔ پیسے تو ٹکٹ اور ٹیکسی

میں گئے بھیل پوری اور بھجیوں پر ہی اکتفا کرنی پڑتی ہے۔

خدا جانے کلاس میں کیا ہوا کرتا ہے۔ زیادہ تر طالب علم تو سڑک پر کھڑی موٹروں کے گرد کھڑے گپّیں مارا کرتے ہیں۔ دو چار اُچک کر منڈیروں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ زیادہ تر اچھے خوش حال خاندانوں کے بچے ہیں۔ جدید ترین فیشن کے بال اور لباس۔ کوئی غریب اور مفلس ملا نہیں۔ ایسوں کو یہاں داخلہ ہی نہیں ملتا۔ زیادہ تر انھیں ہی ملتا ہے جن کے باپ کا رُسوخ چلتا ہے۔

یہ نوجوان کتنے ہشاش بشاش اور بے فکر نظر آتے ہیں۔ ایکبار داخلہ ہو جائے کتاب اور کاپیاں خرید لی جائیں بس پھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کتابوں میں علم کی دولت بھری پڑی ہے۔ جس کے پاس یہ خزانہ موجود ہو بھر اسے کیا فکر ہو سکتی ہے۔

سڑک پر گپّیں مارتے جی اُکتا جاتا ہے تو یا تو ڈیڑھ بجے کا شو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ نہ ملا تو ساڑھے تین بجے کا تو ہاتھ سے نہیں جا سکتا۔ گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی تو کہہ دیا آج ٹوٹوریل تھا یا کوئی اور ہنگامہ تھا۔

ڈیڈی کو اپنے کام سے اتنی فرصت ہو تب تو کچھ پوچھ گچھ ہو۔ ممّی لنچ کے بعد اپنی سہیلیوں کے ساتھ خود فلم دیکھنے چلی جاتی ہیں۔ یا رمی کی بیٹھک ہوتی ہے بچّے دیر سویرے بھی آئیں تو کچھ دھیان نہیں رہتا۔

مصیبت جب آتی ہے جب ششماہی امتحان سر پر آجاتا ہے۔ بھاگ دوڑ کر کے پھر ٹیوٹر لگائے جاتے ہیں۔ کتابیں جو اِدھر اُدھر دوستوں کے گھروں میں بھولے سے چھوڑ دی تھیں ڈھونڈھی جاتی ہیں یا اِدھر اُدھر سے مانگ کر کام چلایا جاتا ہے۔ بڑے زور شور سے پڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ چائے اور کافی پی پی کر رات کے بارہ بجے تک پڑھائی پھر صبح چار بجے کا الارم لگا کر جُٹ جاتے ہیں۔ ہوش و حواس گم بڑی پابندی سے کلاس میں حاضر جلدی جلدی ان لوگوں سے نوٹ مانگے جاتے ہیں جو لوٹ لے سکے تھے۔

کچھ پلے نہیں پڑتا (KEY) کی مدد بھی کام نہیں آتی۔ سوائے نقل کے اور کوئی چارا نہیں۔ نقل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ کچھ تو پاس بیٹھنے والے کام آجاتے ہیں پھر کچھ پرچوں پر لکھ کر بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی سورما ہیں جو پوری پوری کتابیں لے جاتے ہیں۔ اِن وجی لیٹر کی اگر شامت آتی ہے تو دخل در معقولات کی سزا میں ٹھگ جاتا ہے جو سمجھدار ہے نہایت بے تکلفی سے اخبار بیٹھا دیکھتا رہتا ہے۔ اور بھی زیادہ عقلمند ہوتا ہے تو اشارے کنائے سے مدد بھی کر دیتا ہے۔ وہ بھی جانتا ہے۔ کہ یہ یہاں عِلم حاصل کرنے نہیں آئے۔ ڈگریاں یے آئے ہیں۔ اس کی لکھی ہوئی (KEY) کو خرید ہی چکے ہیں۔ ان کے باپ بڑے ملنسار اور خوش مزاج ہیں۔ ان کی مائیں بڑی فیاض اور دوست نواز ہیں۔ دعوتوں میں خالص فارن لِکر ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر کو وہ خود یا اس کے دوست ٹیوشن بھی دیتے ہیں۔

اسکول کے بچے تو ہیں نہیں۔ اب یہ کالج کے ذمہ دار اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان پر کوئی سختی تو ہے نہیں“۔ اسکولوں میں بڑی پابندی تھی۔ ٹھکائی بھی ہو جاتی تھی۔ کالج میں تو عیش ہیں۔ کوئی گھر میں بھی پوچھ گچھ نہیں کر سکتا۔ والدین جو پڑھا لکھا تھا بھول بھال چکے ہیں۔ یہ بھی خبر نہیں کالج کے کورس میں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ وہی ایک پروز (PROSE) اور پوئیٹری (POETRY) جو پچیس برس پہلے انگریزوں کے زمانے میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ضرور ایک آدھ شیکسپیئر کا ڈرامہ ہوگا۔ ریپڈ ریڈنگ (Rapid Reading) میں اسٹیونیسن (Stevenson) ہوگا۔ اکنامکس کی کتاب ابھی چھپ کر ہی نہیں آئی۔ کئی سال سے چھپ رہی ہے۔ کتنی کتابیں بازار میں ملتی ہی نہیں مگر کورس میں ہیں۔ جرمن پڑھانے کے لیے کوئی اُستاد نہیں جڑتا۔ فلورا فاؤنٹین کے پاس ایک بوڑھی جرمن عورت نے ایک ٹیوشن کی کلاس کھول دی ہے جنھیں شوق ہو وہ وہاں جا کر پڑھ لیں۔

میرا فلیٹ جے ہند کالج کے عین سامنے ہے۔ میری بیٹی کے دوست کبھی پانی پینے

یا اُستانے آجاتے ہیں۔ بڑے زندہ دل اور چونچال بچے ہیں۔ پورے وقت فلمی رسالوں پر جٹے فلم پر بحث کیا کرتے ہیں۔ کئی لڑکے راجیش کھنہ جتیندر امیتابھ بچن کے ہم شکل ہیں۔ عین ویسے ہی بال، ویسی ہی بھڑک دار قمیص اور بیل بوٹم پینٹ اور لڑکیاں تو سبھی راکھی اور جیا بھادری ہیں۔ جوائے مکرجی اسی جے ہند کالج میں پڑھتا تھا۔ سادھنا بھی یہیں پڑھتی تھی اور اب یہ طلبہ بھی یہیں پڑھتے ہیں۔"

"تم اتنے فلم دیکھتے ہو تو پڑھتے کب ہو۔" میں پوچھتی ہوں۔

"پڑھ لیتے ہیں" وہ بڑے تکلف سے ٹال دیتے ہیں۔

"تمہارا دل نہیں لگتا پڑھنے میں۔"

"دل لگنے کی کیا بات ہے۔" وہ ہنستے ہیں۔

"اٹ از سو بورنگ۔"

"ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ہم سے نوٹس نہیں لیے جاتے۔ سر نہ جانے کیا بتاتے ہیں کچھ پلے نہیں پڑتا۔"

"اور کتابیں" میں پوچھتی ہوں۔

"بڑی ڈل ہیں۔"

"اور امتحان کیسے دیتے ہو۔" مَیں کریدنا چاہتی ہوں۔

"ہم تو رَٹ لیتے ہیں۔"

"نوٹس پڑھ لیتے ہیں۔"

"کی (KEY) میں بہت صاف سمجھ میں آتا ہے۔"

"اور نقل" میں مذاق میں پوچھتی ہوں۔ سب ہنسنے لگتے ہیں۔ اپنے جُرم کا اقبال نہیں کرتے مگر اوروں کی چالاکیوں کے قصے سُنانے لگتے ہیں۔ کون کیسے پاس ہوتا ہے میں ان بچوں کی ہوشیاری اور دیدہ دلیری پر دنگ رہ جاتی ہوں ایک بڑا ہی ہوشیار لڑکا

ہے وہ اپنے پرچے کے ساتھ اپنے دوست کا پرچہ بھی کرتا ہے۔ ایک سوال کے پچیس روپے لیتا ہے۔

"تمھیں علم حاصل کرنے کا شوق نہیں۔" میں پرانا پٹا ہوا جملہ دُہراتی ہوں۔

"کیا فائدہ۔"

میں لاجواب ہو جاتی ہوں۔ وہ تشریح کرتے ہیں۔

"علم سے کیا حاصل۔"

"تاکہ دوسروں کو دے سکو۔" میں دوسرا گھسا ہوا جملہ استعمال کرتی ہوں۔

ہیں۔ ٹیچر تو مر کے بھی نہیں بننا۔

کورس کی کتابیں تو جلا دینے کو جی چاہتا ہے۔ پڑھنے کے بعد پڑھانے کے خیال سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

"تو بس ڈگری چاہیئے۔"

"ہاں جواب کے لیے ڈگری کی ضرورت پڑتی ہے۔

"علم کی نہیں۔"

"تمھیں بس ڈگری دکھانے کے لیے باقی اصل کام تو رسُوخ اور سفارش سے بنتا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔" میں قائل ہو جاتی ہوں۔

"اِنٹرویو انگلش میں ہوتا ہے۔ ہم کونوینٹ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمیں جواب دینے میں کیا مشکل ہو گی۔ بس فٹاک فٹاک اِنگلش بولنے والے کا رعب پڑ جاتا ہے۔"

"اگر ہندی میں انٹرویو ہونے لگے تو۔"

"تو ہماری چھٹی۔ ہماری مادری زبان ہندی نہیں۔"

"پھر۔"

"گجراتی۔"

"سندھی۔"

"مرہٹی۔"

"تامل۔"

"پنجابی۔"

اُنھوں نے چودہ زبانیں گنا دیں۔

"مگر ہمیں اپنی مادری زبان بھی نہیں آتی۔"

"کیوں۔"

"جب کانوینٹ میں نام لکھوایا گیا تو سسٹر نے کہا کہ بچے سے گھر پر صرف انگریزی بولی جائے۔ تب سے ممی ڈیڈی انگلش ہی بولتے رہے۔ بس مادری زبان اِنگلش ہی ہے۔"

"مگر ہندی تو تمھیں سیکھنی چاہیے۔" میں نے رائے دی۔ "کیونکہ وہ سرکاری زبان ہے۔"

"اور مراٹھی صوبہ کی زبان ہے اس لیے سیکھنی چاہیے۔"

"تین زبانیں کون سیکھے۔"

"مجھے تو جرمن بھی پڑھنا پڑتی ہے۔"

"میں نے فرینچ لی ہے۔"

میرا سر چکرانے لگا۔ اُف یہ بچے اتنی مختلف زبانیں پڑھتے ہیں جن کی لپی میں اتنا فرق سے دنیا کے کسی ملک میں اتنی زبانیں سیکھنا ضروری نہیں۔ انگریز بس انگریزی پڑھ کر دُنیا کا علم حاصل کر لیتا ہے۔ چینی چینی زبان میں جاپان والے جاپانی زبان میں اور روسی اپنی زبان میں علم حاصل کرتے ہیں۔

مگر ہندوستان کے پروگرام میں مقصد علم حاصل کرنا ہے ہی نہیں۔ بس ڈگری کے بعد نوکری یہی مقصد زندگی ہے۔ اُونچا طبقہ انگریزی پورے انہاک سے پڑھتا ہے کہ سارے

ملک کا کاروبار اسی زبان کے ذریعے ہوتا ہے۔ اگر کوئی احمق اپنی مادری زبان میں علم حاصل کرنے کی کوشش کرے تو بن موت مارا جائے۔ پھر یہ کم بخت سرکاری زبان بھی بس ڈھکوسلا ہے۔ کام بالکل نہیں آتی۔ انگریزوں پر ناحق ہی الزام ہے کہ انھوں نے انگریزی ہماری جان پر لادی دی پچیس برس سے ہم خود اسے لادے ہوئے ہیں۔ انگریز جب یہاں آیا تھا تو کس تیزی سے انگریزی زبان نے فارسی اور اردو کا خاتمہ کر دیا تھا۔ میرا مطلب ہے سرکاری دفتروں میں انگریزی چالو کر دی تھی۔

زبان کے بعد پھر تعلیم کا سوال اُٹھا۔ بڑی بحث کے بعد طلبا نے قائل کر دیا کہ علم کسی شعبہ میں کام نہیں آتا۔ بھلا دفتر میں شیکسپیر اور ملٹن کس کام آتے ہیں۔ زندگی میں زیادہ تر کام ہتھکنڈوں کے بل بوتے پر ہوتے ہیں۔ آج کل کے بچے بڑے صاف گو ہوتے ہیں۔ بڑی سادگی سے بتا دیتے ہیں کہ ان کے پاپا کس طرح کالا دھندا نہایت ایمانداری سے کرتے ہیں۔ کس طرح سمگلنگ کے سامان کی نکاسی کرتے ہیں۔ حشیش اور مرجوانہ کے بیوپار میں کتنا شاندار منافع ہے۔ پکڑے جانے کا کوئی سوال نہیں۔ دو فیصدی پکڑا بھی جائے تو بھی منافع ہے۔ بس دکھاوے کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ کروڑوں کا مال صاف نکل جاتا ہے۔ یہ نوجوان کتابوں میں کیا لکھا ہے کیوں جانیں جب وہ یہ جانتے ہیں کہ ایک کے ہزار کن ہتھکنڈوں سے بنائے جاتے ہیں۔ عملہ کو کیسے کھلا پلا کر کام بنایا جاتا ہے۔ صرف احمق ہی کتابوں کے جھمیلے میں پڑ کر بھوکے مرتے ہیں۔ ہوشیار لوگ نقل کر کے پاس ہو جاتے ہیں کہ ان ڈگریوں سے رعب پڑتا ہے۔ آڑے وقت میں کام آتی ہیں۔ ویسے دادا پردادا بغیر ڈگریوں کے لکھ پتی ہو جاتے تھے۔

”ہمارے دادا کو دستخط بھی کرنا نہیں آتے تھے۔ انگوٹھا مار دیتے تھے۔“

لڑکیاں بھی پڑھائی میں آنکھیں پھوڑنا حماقت سمجھتی ہیں۔ ماڈلنگ زیادہ دلچسپ اور منافع بخش ہے۔ فلم میں جانے کا موقع بھی رہتا ہے۔ ویسے عشق وقت گزاری کے لیے

کیا جا سکتا ہے۔ اور کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر شادی بڑے غور و خوض کے بعد والدین کی رائے سی ہی کرنا چاہیئے۔ وہ بھی تگڑی آسامی سے۔ شادی ضرور کرنا چاہیئے کہ ہر فلمی ہیروئن سوائے شادی کے فلم میں اور کچھ نہیں کرتی۔ بس ایک ڈگری مل جائے تو کام بن جائے گا۔ ویسے گھر میں دولہا کے انتظار میں بیٹھنے کے بجائے وقت گزاری کے لیے کالج ہی رہ جاتا ہے۔ جس وقت بھی لڑکا مل جاتا ہے۔ والدین تعلیم چھڑا کر بیاہ کر دیتے ہیں۔ یہ کالج کی تعلیم بھی ڈھکوسلا ہے۔ صرف بدصورت غریب اور گھیگھلی لڑکیاں پڑھ کر استانیاں بنتی ہیں۔ امیر لڑکی اوڑھنے پہننے کا سلیقہ حاصل کر کے فٹافٹ انگریزی بولتی ہو شادی ہو جاتی ہے۔ اچھا تگڑا جہیز ہو تو لڑکوں کی کمی نہیں۔

رہیں غریب لڑکیاں جن کے پاس صورت ہو وہ کہیں ہاتھ مار لیتی ہیں۔ جو اس دولت سے محروم ہیں وہ بھی پڑھائی سے کتراتی ہیں۔ پڑھ کر ٹیچر بن گئیں یا کلرکی ہاتھ آئی۔ سب بے کار اس سے تو کال گرل زیادہ کما لیتی ہے۔ صورت کی ضرورت نہیں اچھا جسم ہو تو کام بن جاتا ہے۔ نئے نئے ہوٹل کھُل رہے ہیں۔ تھوڑا سا مٹکنا آ جائے تو اسٹرپ ٹیز بھی کافی اچھی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ہیئر ڈریسنگ میں بھی بہت فائدہ ہے۔ آج کل عورتوں کو بال بنوانے کا خاصہ جنون ہے۔

مگر ہر جگہ ڈگری کی قیمت چلتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو جو یہ کالج سنیما گھروں میں تبدیل کر دئے جائیں ہوٹل بنا دئے جائیں ریسٹوران میں ڈھال دئے جائیں اور ڈگریوں کے لیے ایک ملک بوتھ (دودھ کی دکان) جیسے ڈبے لگا دئے جائیں جہاں فٹافٹ بڑی بڑی فیسیں لے کر ڈگریاں دیدی جائیں۔ جیسے جھوٹے پرمٹ اور لائسنس ملتے ہیں۔ اس میں تو سرکار کا بڑا فائدہ ہے۔ خرچ کم اور منافع زیادہ۔ اتنا بڑا اسٹاف پالنا یونیورسٹیوں کے چانسلر اور وائس چانسلروں کے خرچے پروفیسروں کی مصیبت۔ نہ ان کی کوئی ضرورت نہ کوئی ان کی عزت کرتا ہے۔ سب سفارشوں اور رشوت سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اکڑ فوں دکھاتے

ہیں تو اُٹھا کر پیٹ دے جاتے ہیں۔ میں خاموش ان طلبا کو دیکھتی ہوں۔ وہ بڑے ذہین ہیں۔ بڑے شریف اور مہذّب ہیں۔ زندگی کی قدریں کچھ ایسے توڑ موڑ کر ان کے سامنے پیش ہوئی ہیں کہ ان کا یقین بھی مسخ ہو گیا ہے۔ ابھی ایسے طلبا کی تعداد زیادہ نہیں کیونکہ ایسا طبقہ ابھی محدود ہے۔ مگر یہ وہ مختصر سا طبقہ ہے جو آئندہ چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ یہ انگریزی داں امیر طبقہ ہے جو الیکشن پر قابو پائے گا اور اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن جائے گا۔ ان میں سے کوئی راک فیلر بن جائے گا کوئی فورڈ کوئی نکسن کا روپ دھارے گا۔ ملک سے باہر اس کا رُسوخ نہ ہو گا۔ اس لیے ہندوستان کا ہی کوریا اور ویت نام بنائے گا۔

یہ مٹھی بھر چنے بھاڑ پھوڑیں گے۔ یا کچھ ہو جائے گا۔

یا بھاڑ نہیں بھون کر رکھ دے گا۔

غیاث احمد گدی

میمنہ

”ممی تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہی تھیں ...... ،“ لڑکی نے کہا اور گردن نکال کر باہر دیکھنے لگی۔ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ کوئی ڈر نہ خوف۔ جس آدمی کے ساتھ وہ جا رہی تھی اسے اس پر اعتماد تھا۔ آج نہیں تو کل جو کچھ اس کے پاس ہے اس آدمی کا ہو جائے گا۔ پھر مجھے کیا فکر۔ اپنی چیز کو وہ آپ سنبھالے۔

دودھیا رنگ کی فیٹ تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے۔ اُس کے سنہرے باب کٹے ہوئے بالوں کو دھنکے چلے جا رہے تھے۔ وہ باہر کھیتوں کی ہریالی میں کھوئی رہی۔ جہاں صبح زندگی جلوہ آرائیوں میں یوں مصروف تھی کہ دُور دُور تک روشنی پھیل گئی تھی ” روشنی اور تازگی“ حسن اور نغمگی ” رنگ اور ترنگ“ خواب ناک سچائیوں کی نقاب نہ جانے کہاں کھو گئی تھی“ اور اب جو تھا کھرا تھا“ سچا تھا اور خوبصورت تھا۔

دفعتاً سامنے ایک چھوٹا سا سفید سفید میمنہ دوڑتا ہوا گاڑی کے سامنے آ گیا۔ نوجوان نے بے حد پھرتی اور تیزی سے اسٹیرنگ کو کاٹا۔ پہیئے ترچھے ہوئے اور میمنہ کو چھوتی ہوئی گاڑی ایک طرف کو کھڑی ہو گئی۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

سڑک پر گرا ہوا میمنہ اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا نیچے کھیتوں میں اُتر گیا۔ لڑکی نے اور خود اس

نوجوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ بچ گیا۔

"ہاں" بال بال بچا ...."

گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ سامنے دور تک دوڑتی ہوئی لمبی سڑک پر نظریں جمائے جمائے نوجوان نے ذرا پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑا۔ اس کا ہاتھ اسٹیرنگ وھیل پر سختی سے جما ہوا تھا۔ ایک دوراہا آیا۔ بھاگتی ہوئی فیٹ کو اس نے ہلکے سے بریک دیا اور اُترکو جانے والی سڑک پر گاڑی کو ڈال دیا۔

"ممّی اکیلے کیوں آنے نہیں دے رہی تھیں ... ..."؟

پتہ نہیں کیوں .... شاید انھیں ڈر ہو کہ تم مجھے بھگا کر نہ لے جاؤ۔ لڑکی بیساختہ ہنسی۔ کچھ عجیب سی دُھلی دھلائی سی ہنسی۔ جواب میں نوجوان بھی ہنسا جو پچھلے سترہ دنوں سے منگیتر کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ لڑکی کی بات سُن کر وہ ہنسا ضرور لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنے کے بجائے اس نے ایک الگ بات کہی۔

"رما تم ہنستی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے ... ..."

"کیسا محسوس ہوتا ہے" اس نے پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑی اب ہونے لگے رومانٹک ذرا میں۔"؟؟

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" نوجوان نے ایک نظر لڑکی کی طرف ڈالی اور پھر سڑک کو دیکھنے لگا" سچ کہہ رہا ہوں تم ہنستی ہو تو.... ... لگتا ہے کہیں کوئی پرندہ، کوئی کبوتر پھڑپھڑا رہا ہے" ....!

"کبوتر نہیں جناب فرشتہ کہئے فرشتہ" لڑکی نے قطع کلام کرتے ہوئے ذرا اترا کر کہا" جناب آپ نے میرا رول دیکھا ہے ڈرامے میں" وہی فرشتہ ہوں ..... لیکن آپ۔

"مَیں ۔"

وہ لڑکی پھر کھلکھلا کر ہنسی۔" آپ شیطان بنے تھے نا.... ..."

اتفاق سے اسے ڈرامے میں حصہ لینا پڑا تھا۔ ڈرامے سے اس کی دلچسپی صرف کالج کے دنوں تک تھی، اب یہ شوق کہاں وہ ہر روز لڑکی کو ریہرسل کرانے کلب لے جایا کرتا تھا۔ کل رات ڈرامہ ہونے والا تھا اور کل ہی لڑکا نہیں آسکا تھا جس کا ایک خاص رول تھا سارے لوگ پریشان تھے۔

لڑکی کی سہیلیاں بدحواس سی مری جارہی تھیں۔ تب اس نے اپنے آپ کو اس رول کے لیے پیش کردیا۔ لڑکی اور اس کے تمام دوستوں کو بے حد حیرت ہوئی لیکن تین چار گھنٹے اپنا رول اور مکالمہ یاد کرنے کے بعد جب وہ اسٹیج پر اُترا تو سب دنگ رہ گئے۔

"لیکن کمال کردیا آپ نے، ایسی اداکاری ایک دم سے جنوین ہوتی ... ..."

واقعی اداکاری ایسی غضب کی ہوئی تھی کہ لوگ دنگ رہ گئے تھے۔ ایک وحشی شیطان جب سنہرے بالوں والے فرشتے کی طرف جھپٹا تو تماشائیوں کی سانس اُکھڑنے لگی۔ ایک بار تو وہ لڑکی بھی یوں ڈرگئی کہ اس کا دل دھڑک اُٹھا۔

"اچھا تو بتلایئے تو کتنے دن ہوئے آپ کو یہ سب چھوڑے ہوئے ... ..." لڑکی ریشمی اسکارف ڈھیلا کرتے ہوئے بولی۔

سوال معمولی تھا بے حد معمولی۔ لڑکی نے تو ڈراموں میں حصہ لینے والی بات پوچھی تھی لیکن لڑکی کی یہ بات سُن کر نوجوان کا دل دھڑک اُٹھا ... ... اس کا پاؤں سختی سے ایکسیلیٹر پر پڑا یکایک گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی۔ اس کے ہاتھ شدت سے اسٹیرنگ کو پکڑے ہوئے تھے۔ تیزی سے فیٹ سائیڈ کے دونوں پہیوں پر گھستی ہوئی کچھ دور تک چلی، پھر اچانک سیدھی ہوگئی۔ اس کی رفتار بھی کم پڑگئی۔

"ارے باپ رے ... ... اُفوہ، کیا وحشت میں چلاتے ہو بھائی ... ... ابھی کچھ ہوجاتا تو"

کچھ نہیں رما، کچھ نہیں ہوتا" اس نے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔ "اور میرے

ہوتے ہوئے تمھیں کچھ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔"

لڑکی پر کئی بوتلوں کا نشہ چھا گیا۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کی طرف پیار سے دیکھا، سانولے چہرے پر ہلکی سرخی بکھری ہوئی تھی۔

اس نے پیار بھرے جذبات میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اگر کچھ ہو جاتا تو ... ..."

"لیجئے اب آپ ہونے لگیں رومانٹک ... ..!"

پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

باہر صبح کاذب بکھر گئی تھی۔

کہاں سے یہ آدمی آیا، اور کب اس کی زندگی میں چپکے سے داخل ہو گیا۔ جب آدھی رات کو چاندنی تالاب میں دبے قدموں اتر آتی ہے اور سارے تالاب اس کے اندر اور باہر کو جگمگا دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ محسوس ہوا۔ اس نے بند آنکھوں سے دیکھا۔ سامنے کون تھا ... ... کوئی ہو گا ... ... اس کے چہرے پر گرم گرم سی بھاپ پڑی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"ارے باپ" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ جلدی سے اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ نوجوان ہنس پڑا۔ ذرا دیر۔ پانچ سکنڈ اور آنکھیں بند رہیں تو... ... بس

"چُپ ... ..." لڑکی ہنسی" جان سے مار دوں گی ... ... ہاں"

نوجوان نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا پڑا۔ ۲۵ دن ہو گئے اس شہر میں آئے ہوئے کیسے وہ اپنی ماں کے اصرار پر لڑکی دیکھنے چلا آیا تھا۔ بڑی بے دلی سے۔ وہ جانتا تھا۔ ہو گی کوئی سونے چاندی میں مڑھی ہوئی ہر وقت سنگھار پٹار میں مصروف رہنے والی لڑکی۔ لیکن لڑکی دیکھی تو عجیب سا لگا۔ پہلے وہ سمجھا کوئی اور ہو گی۔ رما کی چھوٹی بہن۔

جب اس نے پوچھا کہ "ممی" رما کیا یہاں نہیں ہے۔

"ارے نہیں بھئی" میں ہی رما ہوں ... ..." اور وہ ہنستی ہوئی ممی پر لد گئی تھی۔ اسے

عجیب لگا۔ اتنی چھوٹی سی بچی سی، ایسی معصوم سی لڑکی کو کیا کرے گا۔ شادی کے لیے تو بھرپور عورت چاہیے، دانا سمجھدار۔ جو اس کے جذبات کو اس کی ضرورتوں کو سمجھ سکے یہ لڑکی .... تو....

وہ دوسرے ہی دن چلا جانا چاہتا تھا کہ رمّا نے اسے رہرسل میں چلنے کے لیے کہا۔

ہم لوگ بہار کے قحط زدوں کے لیے ایک ناٹک کھیل رہے ہیں۔ چلیے میری دوست کے یہاں رہرسل پر وہاں آپ کو بہت اچھے اچھے لوگوں سے ملاؤں گی" رمّا کے اصرار میں کچھ ایسی بچوں کی سی معصومیت تھی کہ وہ انکار نہ کرسکا۔

اور یوں وہ رُک گیا۔ ایک سے دو، دو سے پچیس دن ہو گئے۔ رفتہ رفتہ رمّا اسے پسند آنے لگی۔ پھر یوں ہوا کہ رمّا کی باتیں، رمّا کی ہنسی، چال ڈھال، اُٹھنا بیٹھنا سب اسے اچھا لگنے لگا۔

اور رمّا، رمّا تو کچھ نہیں جانتی تھی۔ اسے تو جیسے ہی معلوم ہوا کہ یہ مرد جو اس کے سامنے کھڑا ہے وہ اس کا منگیتر ہے، اور اس سے ملنے آیا ہے وہ اسے اپنا سا لگنے لگا۔ جانے آگے کیا ہو؛ شادی ہوگی بھی یا نہیں۔ ہوگی تو نبھے گی یا نہیں اتنا سوچنے کی اسے فرصت تھی نہ ضرورت۔ بس ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے کوئی تکلیف نہیں، کوئی بناوٹ نہیں۔ وہ دوسرے ہی دن سے یوں پیش آنے لگے جیسے اس کی پرانی جان پہچان ہے

دو ہی دن کے اندر وہ مہمان جو اس کو دیکھنے آیا تھا، اس سے رمّا یوں گھُل مل گئی جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو گویا وہ اس سے برسوں سے واقف ہو۔ گھر میں اس کی بوڑھی ماں تھی جو شوہر کے مرنے کے بعد یا چولھے چوکی میں پھنسی رہتی یا پھر اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹی مرحوم شوہر کی تصویر کو گھورا کرتی۔ چھوٹا بھائی یا تو باہر میدان میں گیند کھیلتا رہتا یا پھر اسکول میں ہوتا۔ ایسی حالت میں رمّا ہی اپنے مہمان کی دیکھ بھال کرتی۔ وہ بڑی لاپروائی سے صبح سویرے چائے کی ٹرے لیے مہمان کے کمرے میں بغیر دستک دیے بے جھجک گھس جاتی اسے جگاتی، چائے کی پیالی پکڑاتی اور جلدی سے غسل خانے میں جانے کے لیے کہہ کر باہر چلی جاتی۔

وہ نوجوان خاموشی سے لیکن گہری نظروں سے دیکھتا رہتا۔ یہ کیسی لڑکی ہے۔ ذرا جھجک نہیں، ذرا خوف نہیں۔ یوں رات دن دوپہر اکیلے میں اس کے کمرے میں آجاتی ہے، ہنستی ہے، بولتی ہے۔ کچھ محسوس نہیں کرتی کہ زندگی کبھی کبھی کھسوٹ لیتی ہے۔ کوئی گرم ہوا کا جھونکا اس کو چُھو کر چلا جائے تو...... ؟

لیکن گرم ہوا کا جھونکا کہیں نہیں ہوتا۔ صرف ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہوتی، چھاؤں ہی چھاؤں، چاندی ہی چاندنی مجھے خود تعجب تھا۔

دیکھیے جب ہماری شادی ہو جائے گی۔ اور آپ یوں اتنی دیر تک سوتے رہیے گا تو جانتے ہیں میں کیا کروں گی۔

کیا کرو گی۔ وہ پیار سے اس کی طرف دیکھتا۔

" ماروں گی آپ کو ایک تھپّڑ ... ...

" ارے اچھا چلو ابھی ممّی کو کہتا ہوں ... ..."

" چلیے " اور وہ اس سے پہلے ہی ممّی کو کہہ دیتی " ممّی میں ان کے ساتھ کیسے نبھا سکوں گی۔

" ممّی تعجب سے اور غصہ سے اس کی طرف دیکھتی " کیا بک رہی ہو رمّا ... ..."

" سچّی ماں یہ کہتے ہیں کہ تم جس دن دیر سے سو کر اُٹھو گی تو خوب پیٹوں گا ... ... ایسے آدمی سے ... ...

" ممی زور سے ہنس دیتی " ٹھیک ہی کہتا ہے میرا بیٹا ..... پٹے بغیر تو ڈھنگ سے کبھی نہیں رہے گی۔ وہ نوجوان بھی ہنس دیتا، رمّا کو ذرا چھیڑنے کے لیے کہہ اُٹھتا ...... نہیں ممّی یہ خود کہتی ہے کہ ... ... "

رمّا تڑپ کر اٹھتی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیتی ... ... " ارے ارے، کیا آپس کی سب باتیں ممّی سے کہہ دوگے۔

نہیں فقط پٹنے والی بات ... ... "

"اب بس کرو بھئی ...... رما اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے بات موڑنے کی کوشش کی۔ "اچھا بھئی شادی کے بعد پیٹ لیجئے گا۔

دفعتاً گاڑی رک گئی۔

"تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔ اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا۔

"لو یہ بھی کوئی پوچھنے کی جگہ ہے۔" اس نے ساتھ نظر آنے والے گاؤں کی طرف دیکھا۔ جہاں صبح کی پہلی دھوپ اور گھروں سے اُٹھنے والا دھواں آپس میں خلط ملط ہو رہے تھے۔ سارا گاؤں کہانیوں کی طرح عجیب اور پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ذرا دیر کے لیے اس کو بھول گئی اور باہر کی پُراسرار دنیا کی خوبصورتیوں میں بہہ گئی۔

"رما سچ سچ بتاؤ"۔ ابھی ابھی جواب دو"۔ نوجوان نے سگریٹ نکالا اور دیا سلائی دکھا دی۔

"مگر کیا بھئی ...... رما باہر کی طلسمی صبح کے ماحول سے لوٹ آئی اور نوجوان کی طرف مسکراتے ہوئے یوں دیکھا کہ وہ اپنا سوال بھی بھول گیا۔

"یہی" یہی کہ تم مجھے پسند کرتی ہو نا۔

"ارے تو اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار لیا۔" کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا بھی نہیں میں نے سوچا جانے کیا کہنا ہے' اسے' جواب یہ ہے کہ ..... نہیں صاحب بالکل نہیں ......

"سچ" نوجوان جانتا تھا کہ وہ لڑکی سنجیدہ نہیں ہے۔ پھر بھی ذرا تشویش ہوئی۔ وہ سمجھ نہ سکا۔

"بالکل سچ"۔

" پھر مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو۔ بھلا"

" اب چلو نا بھئی ...... تم بھی عجیب سے سنکی آدمی ہو۔ ایک دم سے بدھو ہو جیسے۔

" تم رما جب تک میری اس بات کا جواب نہیں دو گی تب تک گاڑی ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی۔"

"اچھی مصیبت ہے ...... بچوں کی طرح ضد کرتے ہو ......" رما ذرا سی چڑھ گئی لیکن

ساتھ ہی ہنس بھی پڑی۔

"ارے بھئی شادی اس لیے کرنا چاہتی ہوں کہ تم بے حد دولت مند جو ہو .... تمھیں پتہ ہے آج کل یورپ میں لڑکیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مَردوں سے شادی رچاتی ہیں جن کے پاس پیسے بہت اور عقل کم بہت کم ہوتی ہے۔ تاکہ بیوقوف شوہر کی دولت اور اپنے حسن سے غیر مردوں کو زیادہ سے زیادہ رجھا سکیں۔

"نوجوان کِھلکھلا کر ہنس پڑا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

"لیکن ذرا دیر بعد لڑکی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اسے اپنے اس مذاق کے ردِّعمل کی توقع نہ تھی لیکن جب اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ دیکھا تو دفعتاً اسے بڑا مزا آیا۔ وہ چور نظروں سے اس کی طرف دیکھ لیتی اور اندر ہی اندر ہنس پڑتی۔

"گاڑی اپنی رفتار سے ہموار سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ دو رویہ درختوں کی قطاریں تیزی سے سَر جُھکائے اُلٹے قدموں بھاگی جا رہی تھی۔ رما کو ایک عجیب لُطف آ رہا تھا اُس نے زندگی میں کبھی کسی ایسے آدمی کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا جس سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہ ہو اور اجنبیت کے باوجود بھرپور اعتماد بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ پہلی بار کسی مرد سے اتنا کُھل کر مذاق بھی کر رہی ہے۔

"لیکن نوجوان پر اس کا اچھا اثر نہ پڑا۔ اسے کچھ عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی ذرا دیر بعد اس نے اپنے آپ کو جھٹک دیا اور خود کو ہلکا کر لیا۔

"مذاق "مذاق تھا۔ ایک نوخیز سی کمزور سی لڑکی پہلو میں بیٹھی تھی اور بڑی بے فکری سے بیٹھی تھی، اسے کسی بات کا خوف جھجک بھی نہیں۔

"تو آپ بھی میرے پیسوں سے عاشقوں کو رجھایا کریں گی۔ کیوں"۔

"ضرور۔"

"کتنے عاشق ہیں آپ کے"۔

”فی الحال تو ایک ہی ہے .... ویسے ... ...“ بہت دیر سے ضبط کی ہوئی ہنسی اس کے اختیار سے باہر ہوگئی اور وہ کھلکھلا پڑی۔

”پھر وہی پروں کی پھڑپھڑاہٹ ... ...“

لیکن وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ عجیب بات ہے۔ اس کی زندگی میں کتنی لڑکیاں آئیں۔ راتوں کو آباد کیا اور چلی گئیں۔ جسم ہی جسم، جو خوشی سے تیار نہ ہوئی اس نے پیسوں کے آگے سر جھکا دیا اور جسے پیسہ بھی نہ جھکا سکا وہ اس کے مضبوط بازوؤں میں تڑپ کر رہ گئی۔ جوانی کی پندرہ برس کی طویل مدت میں رنگ و بو کی طرح کتنی ہی حسین راتیں آئیں اور اس کے ایوان کو مہکا کر چلی گئیں۔ کتنے ہی خوبصورت جسم جلے بیچھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے راکھ کی مانند بے رنگ اور پھیکے ہوگئے۔

مگر یہ لڑکی ... ...

لیکن اس سے پہلے ایک لڑکی اس کی زندگی میں اور آئی تھی۔ سنبل وہ بھی ایسی ہی تھی، اسے یاد آیا۔ وہ بے حد نازک، بے حد خوبصورت، بے حد محبت کرنے والی، اس کی باتوں میں اس کے انداز میں اس کی گفتگو میں جانے کیا چیز تھی کہ وہ ہمیشہ اسے اُلجھائے رہی۔ اس کی نگاہوں کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ جانے کیا چیز تھی جو سنبل کے جسم کی حفاظت کرتی رہی تھی اس کی اداؤں میں عجیب جادو تھا جس کے باعث ہر وقت کہرہ اس پر چھایا رہتا۔

احساسات میں ٹھنڈی آنچ سی سُلگتی رہی۔ اس کا وجود موم کے ٹکڑے کی طرح ذرا نرم سا ایک سرمستی کے عالم میں سنورتا رہتا۔ کمہار کی کچی مٹی کی طرح سنبل کی آواز اس کے سارے وجود کو آہستہ آہستہ الگ الگ شکل دیتی رہتی۔ جدھر چاہتی اس کا رُخ موڑ دیتی۔

کبھی کبھی جب وہ اکیلا ہوتا، بہت سوچتا ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس ذرا سی لڑکی میں کیا چیز ہے جو اس کے سارے جذبات پر سخت پہرے دار کی طرح چوکس رہتی۔

زندگی کے گہرے رنگوں میں ہر جگہ سنبل کا اپنا رنگ بڑا شوخ، بڑا واضح تھا اور وہ رنگوں

کے شور میں کمزور اور مجبور آواز کی طرح گم ہو جاتا۔

ہزار خواہش ہونے کے باوجود وہ سنبل کے سامنے کچھ سوچ نہیں سکتا۔ اور تب وہ سوچتا کہ سنبل سے کوئی رشتہ ضرور ہے۔ ایسا جو بے حد مقدس ہے۔ ایسا جو بے حد پاکیزہ ہے۔ یقین سے دور وہاں بھی جہاں اندھیرا ایک چراغ کی طرح روشن رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سر بہ زانو پاتا اور خاموشی سے آس پاس تکتا رہتا جیسے اس کے سوچنے کی، سمجھنے کی، کچھ کرنے کی ساری طاقت سلب ہو گئی ہو۔

اس نے بڑے سے دریچے کے باہر کھلے آسمان کی نیلاہٹوں میں کالے کالے بادلوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے دیکھا، دوڑتے ہوئے آگے پیچھے ایک خاص فاصلہ بناتے ہوئے وہ دونوں بھاگے جا رہے تھے کہ اس نے دیکھا دفعتاً تعاقب کرنے والے سفید بادل نے اگلے کو جا لیا...... پھر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں کتنے برس ہو گئے وہ سنبل کو اپنی زندگی کا رفیق بنانا چاہتا تھا۔ زندگی کی ساری سیاہیاں اس کے قدموں میں بکھیر دینا چاہتا تھا۔

اور چاہتا تھا، اور چاہتا تھا...... ......

لیکن یہ سب نہیں ہوا اور جو کچھ ہوا وہ اسے یاد بھی نہیں کرنا چاہتا۔ سنبل کیسی گہری اور تہہ دار شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ گئے کرچی کرچی ہو کر اس کے آنگن میں بکھر گئے۔ وہ ایک معمولی دربان کے ہاتھوں میں موم کی گڑیا کی طرح ....

بہت دیر تک مہینوں وہ دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر ایک دن اس کے لبوں پر زہرخند ابھرا اور اس دن اس نے جھاڑو لے کر ان ساری کرچیوں کو بٹور کر باہر کسی تاریک گڑھے میں پھینک دیا۔

لڑکیاں سب ایک سی ہوتی ہیں۔ سب ایک سی صرف اوپر سے ملمع معلوم ہوتا ہے جو ذرا سی آنچ سے اتر جاتا ہے...... ......

کیا سوچ رہے ہو ......" بہت دیر تک خاموشی دیکھ کر لڑکی نے پوچھا۔

گاڑی اب سڑک کے ڈھلان میں تیزی سے بھاگتی جارہی تھی۔ اس نے رفتار کو کنٹرول میں کرنے کے لیے ہلکے سے بریک پر دباؤ ڈالا۔ گاڑی کی رفتار ذرا سست ہوئی۔ گہری نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"رما ابھی میں تم سے کچھ مانگوں تو تم مجھے مایوس تو نہیں کروگی ...... مجھے دے سکوگی۔"

"کیا" لڑکی نے تعجب اور اپنائیت سے جواب دیا۔ ذرا دیر اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی پھر دفعتاً سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔ ایک طوفان سا اُٹھا۔ سمندر کی ایک تیکھی لہر چیختی ہوئی آگے بڑھی بڑے شور سے نیلا آسمان ٹوٹا ...... لیکن چند منٹوں میں سب کچھ تھم گیا۔ اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور ٹھہراؤ سے جواب دیا۔

"ہاں ضرور" اس نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔ کچھ کیا، تم چاہو تو سب کچھ تمھارے قدموں میں ڈال دوں گی۔

جواب سُن کر نوجوان کے ہونٹ بھنچ گئے۔ آنکھیں سُرخ ہونے لگیں، اس نے اور گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"سب کچھ ...... سب ......"

"ہاں، سب کچھ ......" لڑکی نے اطمینان اور سادگی سے جواب دیا۔

"وہ سب کچھ جو تمھارا ہے ......"

جواب خلاف توقع تھا۔ نوجوان چونکا۔ پیشانی پر تیوریاں اُبھریں۔ کئی گہری گھاٹیوں میں صحیح وسالم نکل کر وہ باہر آیا اور پوچھا۔

"اور وہ سب کچھ جو میرا نہیں ہے۔

"وہ تو میرا ہے۔ چھوٹا سا سفید سفید میمنہ کی طرح پیارا پیارا ......"

لڑکی نے ہنستے ہوئے معصومیت سے جواب دیا۔ "اسے تو جب ہی دوں گی جب میرا

جی چاہے گا ... ..."

" ایک معمولی سی سادہ سی لڑکی کیا کہہ گئی۔ اس نے پل بھر میں اپنی طویل زندگی کا جائزہ لیا۔ ایسی سیدھی صاف اور دو ٹوک بات ... ... اس نے کبھی نہیں سُنی تھی ... کبھی نہیں۔

" ذرا دیر بعد اس نے آہستہ سے مگر مضبوط اور تیکھے لہجے میں کہا۔

" اگر میں تمھارے میمنے پر اپنی تیز رفتار گاڑی چڑھا دوں ... ... اسے روند ڈالوں ... ..."

" ابھی اس کا فقرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ لڑکی ہنس پڑی۔

" چہ چہ" تو میرا میمنہ بے چارہ ... ... مر جائے گا۔"

پلٹ کر نوجوان نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے کلیجے پر ایک نشتر سا ٹوٹا۔ باتوں باتوں میں لڑکی کتنی بڑی بات کہہ گئی۔ وہ بہت دیر تک رما کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ جہاں سنجیدگی تھی، وقار تھا، پُراعتماد سکون۔

گاڑی تیزی سے سڑک پر بھاگتی رہی۔ جب وہ ڈھلان ختم ہو گیا اور سڑک ذرا کشادہ ملی تو اس نے دھیرے سے گاڑی کو بیک کیا اور واپس گھر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

"ارے کیا گھر واپس جا رہے ہو ... ... گھاٹی دیکھنے نہیں چلو گے۔

"نہیں " اس کا ہاتھ سختی سے اسٹیرنگ وھیل پر پڑا"۔ نہیں چلو جلدی سے دیکھیں وہ میمنہ جو کیچڑ میں اُتر گیا تھا اسے کہیں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔"

"کچھ دیر تک لڑکی سمجھ نہ سکی۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کے چہرے کی طرف دیکھا جو شانت تھا۔ یوں جیسے آسمان پر سے سارے کالے بادل چھٹ گئے ہوں ... ...

دفعتاً وہ آدمی اسے اتنا پیارا لگا کہ اس کا جی چاہا اپنا وہ چھوٹا سا سفید سفید سا خوبصورت میمنہ چپکے سے اس کی گود میں ڈال دے ... ...

باہر ساری فضا سنہری دھوپ میں خوبصورت دلوں کی طرح چہک رہی تھی ... ...

شوکت حیات

صدیوں کے لمحے

شکستہ مُنڈیریں

مُنڈیروں پر سبز حاشیے

اور ان پر مشتمل ایک غیر آباد حویلی ... ... کھنڈروں میں تبدیل ہوتی ... ... جو ٹھہری ہوئی ہواؤں کے دوش پر کانپتی اور طوفانی ہواؤں کی زد میں ساکت ہوجاتی اور ... ... پاگلوں کی سی حویلی ... ... جو ہے ... ... نہیں ہے ... ... اور نہیں ہے لیکن ہے۔

وہ کھنڈر ہے ... ... عالیشان حویلی رہی ہوگی ... ... اب وہ کھنڈر ہے — ہوا ہے ... ... دھواں ہے ... ...

حویلی بہت اُونچی ہے ... ... اور بھی اونچی رہی ہوگی ... ... اتنی اُونچی ... ... اتنی اُونچی ... ... کہ حدِ نظر آسمان میں گم ... ... اور اتنی چوڑی ... ... اتنی کہ ... ... بے حد تو نہیں لیکن بے تھاہ ... ... کہ دُور دُور تک گولائی میں اس کی چوڑائی پھیلی ہوئی ... ... اور اس حویلی کے ستون بہت اونچے ہیں ... ... اور بھی اُونچے رہے ہوں گے ... ... لانبے لانبے ستون آسمان درختوں کے تنوں کی طرح ... ... اور اب اس گول حویلی کا

گول صحن جنگلی درختوں سے بھر چکا ہے۔

غور سے دیکھنے پر یہ بھی لگتا ہے کہ وہ حویلی نہیں ... ... کھنڈر بھی نہیں ... ... صرف چار دیواریں ہیں ... ... شکستہ دیواریں ... ... زوال پذیر ادوار کی صرف چار دیواریں چھت جو کسی طرح اپنے کھڑے ہونے کی پہچان قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی یہ چمکتی رہی ہونگی۔ ... ... اب اپنے رنگ و روغن کھو چکی ہیں ... ... یا چاروں دیواریں چھت کو چھوتی ہیں یا چھت چاروں دیواروں کو چھوتی ہے۔ ... ... چھت بڑی سخت اور غیر مرئی ہے... آناً فاناً اُڑ کر لاپتہ ہو جاتی ہے اور آناً فاناً آٹیکتی ہے اور معلق ہو جاتی ہے۔

ایک دیوار پر جو پہلی دوسری تیسری یا چوتھی ہو سکتی ہے بل کھاتی ہوئی گیند نما محراب ہے جس میں مکڑیوں کے جالے ــــ دوسری دیوار پر جو پہلی تیسری اور چوتھی بھی ہو سکتی ہے ایک بڑا سا تریشول آویزاں ہے۔ جس کے نوکیلے سرے زنگ لگتے لگتے کند ہو چکے ہیں۔ ایک دیوار پر جو چاروں میں سے کوئی بھی ہو سکتی ہے گرو نانک کی تصویر فریم میں لٹک رہی ہے جس کے شیشے تو بہت پہلے ٹوٹ چکے ہوں گے اب تصویر بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے اور صرف دھول میں اٹی ہوئی مقدس داڑھی نظر آتی ہے چوتھی دیوار جو دوسری تیسری اور پہلی بھی ہو سکتی ہے ایک صلیب ہے جو ٹوٹ چکی ہے۔

تریشول والی دیوار چوڑائی میں سب سے زیادہ ہے۔ گنبد نما محراب والی دیوار اِس سے کسی قدر کم۔ یہ دونوں ہی دیواریں بالکل آمنے سامنے ہیں۔ بقیہ دو دیواروں کی چوڑائی ان سے کم ہے۔ اور ان سبھوں کی یکجائی سے کسی قدر مستطیل نما کمرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ کچھ اور بھی چھوٹی چھوٹی دیواریں ہیں جو اس کمرے کی مستطیل نما ہیئت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہیں کرتیں۔

صحن کے وسط میں ایک مجسمہ ہے جس کا پتھر زرد ہو کر بھربھراتا ہوا بکھر رہا ہے اور اب اس مجسمے کی کوئی شکل نہیں رہ گئی ... ... دو آنکھوں میں ڈیڑھ آنکھیں کہاں چلی گئیں۔ پتہ

نہیں چلتا ... ہاتھوں کی انگلیوں اور پاؤں کی کمی تو ظاہر کرتی ہے کہ یہ مجسمہ کبھی لولہا اور لنگڑا اور کبھی صحیح سلامت بھی رہا ہوگا ..... لیکن اب مجسمہ کی شکل و صورت اس طرح ٹوٹ چکی ہے کہ اس کے بکھرے ہوئے تار و پود کی یکجائی مشکل ہے۔

دیواروں میں نونی لگ چکی ہے اور نقش و نگار دُھندلے ہو رہے ہیں کھنڈر میں تبدیلی ہوتی ہوئی اس حویلی میں بہت کچھ رہا ہوگا ... جاہ و جلال اور سادگی ... رنگ و روغن اور بلندی ... لیکن اب حویلی میں کچھ نہیں ہے ... کچھ پرچھائیاں ہیں جو مہینوں سالوں اور صدیوں کا سفر طے کرتی ہوئی اب بھی اس کے زرق برق ماضی کا پتہ دے رہی ہیں۔

پیوند زمین ہوتی ہوئی حویلی کے ایک کونے میں یا مسمار ہوتی ہوئی شکستہ دیواروں کے بیچ ایک لاش ہے ... نہیں زندگی ہے ... جو ساکت ہے اور جدوجہد کر رہی ہے ... لاش میں حرکت ہوتی ہے اور اس میں لپٹا ہوا پیر نامراد عرصہ دراز کے بعد نیند سے چونکتا ہوا دھندلی آنکھیں کھولتا ہے ... پھر ٹٹولنے لگتا ہے ... اور آنکھوں میں پاگل اور بے قرار ہو جاتا ہے ... دھندلاہٹ بھیگنے اور اُبلنے لگتی ہے۔

بوڑھے کا سارا وجود تروتازہ ہے۔ لمبی نیند سے چونکنے کے بعد آنکھوں میں انوکھی چمک گہری اُداسی اور لازوال طمانیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کسلمندی جو اس نے نیند سے پہلے محسوس کی تھی، وہ تھکن جو غنودگی سے پہلے اسے چور چور کر رہی تھی، اب لاپتہ ہے۔ اور یوں لگتا ہے اس نے پہلی بار زندگی پائی ہو اور پہلی بار موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا ہو۔ شاید اس کی عمر صدیوں سے بھی طویل ہے۔ داڑھی اور بھویں تک برف ہو چکی ہیں۔ اپنے رعشہ میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے آس پاس ٹٹولتا ہوا وہ اُٹھ کر بیٹھنا کھڑا ہونا اور پھر ساری حویلی کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے گر جاتا ہے۔ چھڑی جو ایک کونے میں پڑی ہے ٹوٹ چکی ہے اور اب اسے سہارا دینے سے معذور ہے۔ دیر تک موجود اور لاپتہ بے انت چھت کو وہ گھورتا رہتا ہے جہاں چمگادڑوں کا غول اُلٹا لٹکا ہوا اسے اپنی طرف

بلا رہا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی اور بے بسی جھلکنے لگتی ہے۔

کاش چھڑی مل جاتی۔

اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی کونے میں رکھی ہوئی چھڑی پر پہنچتی ہیں تو آنکھیں اور اندر کو دھنس جاتی ہیں۔

یہ۔ .... یہ .... ٹوٹ کیسے گئی ....

اچھا ہی ہوا .... پرانی چھڑی کو ٹوٹنا ہی تھا ....

اس کے چہرے سے صدیوں کے اس تھکن کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ لمبے عرصے تک پھیلی ہوئی نیند کے ساتھ جڑ گیا تھا۔

بڑی مشکلوں سے وہ اپنی ساری قوت صرف کر کے اُٹھتا ہے اور دیواروں کو حسرت آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا صحن میں نصب مجسمہ کے قریب آتا ہے اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا ہے۔

مَیں کیا دیکھ رہا ہوں ....

کچھ نہیں رہا میری آنکھوں کی روشنی .. ....

یا .... !!!!

ہر طرف اندھیرا کیوں ہے ؟ ....

وہ دھیرے دھیرے سے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

فانوس کہاں ہے جس سے حویلی روشن ہوا کرتی تھی ....

اس کے نورانی اور غیر آسودہ چہرے پر سارے جہاں کی حیرت سارے جہاں کا دکھ سمٹ آتا ہے۔ اس کے لب تھرتھرانے لگتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے ادھورے ادھورے لفظوں کے ساتھ وہ چپ رہتا ہے۔ چاروں طرف سناٹا —— گونجتا ہوا سناٹا —— جامد و ساکت آہٹوں کو سُن کر اسے کچھ خوف معلوم ہوتا ہے۔ نحیف و نازک جسم پر رعشہ طاری ہونے لگتا ہے۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے بہت دُور دُور تک کوئی ہلکی پھلکی

سی دستک کوئی آہٹ کوئی آواز ٹٹولنے میں وہ محو تھا کہ اچانک سناٹے مل کر اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور نوچنے لگتے ہیں۔

اتنا سناٹا تو یہاں نہیں تھا۔ ... ...؟

ابھی وہ سناٹوں کا عادی ہو ہی رہا تھا کہ ہزارہا چمگادڑیں اس کے سر پر سے شور مچاتی ہوئی گذر جاتی ہیں اور پھر وہ دیکھتا ہے کہ ان گنت ٹیڑھے میڑھے چہروں کا ازدھام اسے کچلتا ہوا گذر رہا ہے۔ بوڑھا تھرتھراتا ہوا فرش پر خود بخود لڑھک جاتا ہے اور جیسے اس کے اوپر سے لاکھوں من کا بوجھ گذر رہا ہو۔ مزاحمت میں دونوں نحیف ہاتھ فریادی انداز میں بار بار اپنے بچاؤ کے لیے اُٹھتے رہتے ہیں۔

اتنا شور ... ...

وہ بھیڑ بھی گذر گئی وہ سناٹا بھی ختم ہو گیا اور اب پھر صرف وہی حویلی تھی جو کھنڈر تھا وہی شکستہ دیواریں تھیں اور ان کے آس پاس پھیلی ہوئی گھٹن اور سیلن تھی۔ وہ پھر سے جائزہ لیتا ہے۔

کیا ہو گیا اس حویلی کو ... ... وہ نقشہ کہاں ہے جہاں یہ خط آیا تھا ... ...
چھڑی ٹوٹ گئی اور کونے میں پڑی ہوئی دم توڑ رہی ہے ... ... لیکن اسے توڑا کس نے

... ...

پھر سناٹے کی ایک لہر آتی ہے جو اسے کچلتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ پھر ٹیڑھے میڑھے چہروں والا ازدحام اسے پھلانگتا اور روندتا ہوا گذر جاتا ہے۔

سب انھیں کی کارستانی ہے ... ...

وہ آہستہ آہستہ نیم تاریک کمرے سے پھر صحن میں آتا ہے اور مجسمہ کے ٹوٹے پھوٹے اعضا کو عقیدتوں کے بوسے دینے لگتا ہے۔ یک لخت وہ رک جاتا ہے۔ اس کے ہونٹوں میں مجسمہ کے ٹوٹے عضو کا نوکیلا سرا گڑ چکا ہے اور خون رس رہا ہے۔ وہ مجسمہ کو غور سے دیکھتا ہے۔

اس بدہیئتی سے بے ہیئتی بہتر تھی ...... یہاں اُٹھنے کی بجائے ایمیبا کے جھنڈ میں آنکھیں کھولتا تو کہیں اچھا تھا ...... !

ہلکی ہلکی بارش میں وہ گھوم کر پورا احاطہ پائیں باغ دیکھتا ہے۔ اسے ہر مُنڈیر پر سیاہ کبوتروں کا غوں غٹرغوں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

کیسی نحوست ہے ...... !

نہ وہ نورانی چہرے ...... !

نہ مقدس قبائیں ...... !

نہ وہ پوتر دیویاں ...... !

نہ معصوم راہبائیں ...... !

نہ عود و عنبر ...... !

یہ وہی تو جگہ ہے جہاں ناقوس اور اذان کی آوازیں کانوں میں رس گھولتی تھیں۔ کلیسا کا گجرا اور ست سری اکال شور شرابے سے گھر کو بھی صحیح سلامت سانس لیتے تھے ...... !

وہ نتھنوں کو پھیلا کر زور زور سے سانس لیتا ہے۔ متواتر کئی بار سانسیں لیتا ہے۔

یہاں تو عجیب طرح کی بدبُو ہے۔ ایسا لگتا ہے لاش کی سڑاند پھیلی ہوئی ہے ...... !

وہ گھومتا گھومتا ایک گڑھے کے پاس پہنچتا ہے جہاں انگنت کٹے ہوئے سَر اور دھڑ ایک دوسرے میں اس طرح گتھے ہوئے ہیں جیسے ابھی ابھی جڑ جائیں گے اور جُڑتے ہی بارود کے ایک ذخیرے کو سمندروں میں پھینک آئیں گے۔ گڑھے میں کٹے ہوئے سَر اور دھڑ کے ساتھ ٹوٹی ہوئی تلواریں زنگ آلود کارتوس میزائل اور مشین گنیں ہیں جن پر کرگسوں کے جھنڈ آرام فرما ہیں۔ وہ یاد کرتا ہے۔ یہ وہ تالاب تھا جہاں نہانے سے حیات بڑھتی تھی۔

اچانک بارش تیز ہونے لگتی ہے۔ تیزی بڑھتے بڑھتے طوفان میں بدلتی ہے اور

پھر اولہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ بوڑھے کے سر پر زور زور سے بجڑتے ہوئے برف کے پتھر بالوں کو سُرخ کر دیتے ہیں۔ وہ گرتا پڑتا واپس لوٹتا ہے اور ٹوٹے ہوئے مجسمہ سے لپٹ کر رونے لگتا ہے۔ کوئی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ یہ چیختی ہوئی ابابیلیں تھیں جو اندھا دھند اس سے ٹکرا گئی تھیں۔ بوڑھا مستطیل کمرے میں آتا ہے۔ یہاں بھی اسے اسی قسم کی بدبو دبوچتی ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ پھانسی چڑھنے سے پہلے اس نے کہا تھا۔

"لمبے عرصے تک عمارت کی سلامتی اور بقا کے لیے سبھی دیواروں کی یکساں باہمی مضبوطی ضروری ہے اور یہ مشینی کارگذاری ہی نہیں اس کے لیے بڑی کاریگری بڑی قربانی کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیواروں کی تعمیر کر کے چھت ڈالنے والے جیبوں سے تو فقیر ہوں لیکن اپنی کائنات کے بادشاہ اور ایک دوسرے کے لیے بصد احترام و خلوص سرنگوں ہوں اور ایک دوسرے کا بوجھ بلا دھڑک اپنے سُر پر منتقل کر سکتے ہوں۔" اس نے جو فقیر تھا اور بادشاہ بھی ـــــ سچ کہنے کے جُرم میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا ـــــ اس نے مرنے سے پہلے یہی کہا تھا ـــــ عمر بھر سو جاؤ ورنہ مرتے رہو" ـــــ آج یہ منہدم دیواریں مرنے والے کو اس کے سامنے زندہ کر رہی تھیں۔

اس نے سوچا وہ ہاتھ جنھوں نے اسے پھانسی دی وہ مکروہ موٹے اور چمکتے ہوئے سفید ہاتھ کہیں منڈلا رہے ہوں گے اگر زندہ ہوئے۔

دوسرے ہی لمحہ اسے سبھی دیواروں پر الگ الگ جھنڈ میں مکروہ لیکن چمکدار ہاتھ رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان ہاتھوں کے مُنھ کہاں ہیں۔ ... ...

ان کے چہرے ... ...

دیواروں کی علامتیں اسے مکروہ اور گھناؤنے خدوخال میں تبدیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسے اُبکائی سی آنے لگتی ہے۔ سب کی سب وحشیوں کی طرح اس کی طرف لپکتی ہیں اور ان سے پہلے دیواروں پر رینگتے ہوئے مکروہ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں۔

مَیں کہاں ہوں ... ... یہ وہی جگہ ہے جہاں مَیں ہوں ... ... ! نہیں ... ...

(نہیں ... ... !!! نہیں ... ... نہیں ... ...)

بوڑھا چیختا ہے۔

مَیں اپنے آپ کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ ... ...

(ہوں ... ... ! ہوں ... ... !! ... ...)

مَیں سارے لوگوں کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں ... ... !!)

(ہوں ... ... !!! ہوں ... ... !! ہوں ... ...)

بوڑھے کی چیخ بازگشت کی صورت میں دیواروں سے بار بار ٹکراتی ہے اور بہت دیر تک اس کی سماعت پر زوردار ضرب پہنچاتی ہے۔

وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ دیواروں پر رینگتے ہوئے ہاتھ اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتے۔

مَیں پھر سو جاؤں ... ... یہ ہاتھ مجھے بھی ... ... !

سنو ... ... !

(سنو ... ... !!!! سنو ... ... !! سنو ... ... !)

تمھارا نام

وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔

کچھ نہیں ... ... انانیت ... ... !

وہ چیخ اُٹھتا ہے۔

میں ایسا ہوتا تو اس وقت اتنے سارے خون کے پیاسوں کے درمیان گھرا نہ ہوتا ... ... ! مکروہ کٹے ہوئے ہاتھ میری گردن ناپنا چاہتے ہیں ... ... !

انامیت کی آہٹیں سنتے ہی سچ مچ اس کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو اچانک جھٹکا لگتا ہے اور ایک لحظ کے لیے وہ رک جاتے ہیں۔ دیواریں گھٹی آوازوں سے چیختی ہیں۔ ان کی سانسیں جیسے ٹوٹ رہی ہوں۔

میں جینا چاہتا ہوں۔

میں جینا چاہتا ہوں۔

اور میں بھی ... ...

اور میں بھی ... ...

بے بس آوازیں تھیں جو بلکتے تار تار دامن پھیلا رہی تھیں کٹے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

چھڑی ٹوٹی ہوئی ہوتی تو بچاؤ شاید ممکن تھا ... ... !

کوئی ہے ... ... !

(کوئی ہے ... ... !!! کوئی ہے ... ... !! کوئی ہے ... ... !)

اس کی آواز تھوڑی دیر تک سنسان کھنڈر میں سر مارتی ہوئی گونجتی رہتی ہے۔ پھر سناٹا۔

میں کہاں ہوں ... ...

" کہاں ہوں ... ... کہاں ہوں ... ... کہاں ہوں ... ... ")

اس کی آواز گونجتی رہتی ہے اور پھر وہی سناٹا ... ... وہ سنسان سانسوں کی تاب نہ لا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد بہت دور کھنڈر کے کسی ایک سرے سے سرپٹ دوڑتے ہوئے

گھوڑوں کا قافلہ بتدریج قریب آتا ہے اور اس کے سر پر سے گویا گذرتا ہوا آہستہ آہستہ کھنڈر کے دوسرے سرے میں گم ہو جاتا ہے۔ اب پھر سناٹا تھا۔

کچھ دیر خونخوار چنگھاڑتے ہوئے ہاتھیوں کا جھنڈ دھپ دھپ اور ٹن ٹن کرتا ہوا کسی ایک کونے سے اُٹھتا ہے اور اسے گویا روندتا ہوا گذر جاتا ہے۔

پھر اونٹوں کا ایک جُھنڈ آسمان سے باتیں کرتا ہوا اسے تڑپ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور خاموشی پھر ہواؤں کی طرح قائم تھی۔

اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ صحن میں نصب مجسّمے کے چند بچے ہوئے سالم عضو بھی بکھر بکھرا کر نیچے آ رہے ہیں۔ دیواروں کے نقش و نگار دیواروں کے قدموں میں گرے ہوئے ہانپ رہے ہیں۔

مکروہ کٹے ہوئے ہاتھ مستقل اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ پھر پُکارتا ہے۔

بچاؤ ...... ! بچاؤ ...... !!

(بچاؤ ...... !!! بچاؤ ...... !! بچاؤ ...... !)

بارود کا بھبکہ اُٹھتا ہے اور پھر سَر سَر کرتے ہوئے کئی بھاری بھرکم ٹینک اس کے آس پاس سے اس کے اوپر سے گذر جاتے ہیں۔

کچھ مادر زاد برہنہ مرد اور عورتیں بے خودی میں رقص و اختلاط کرتے ہوئے اسے ٹھوکر مار کر بڑھ جاتے ہیں۔

بوڑھے کا نورانی چہرہ جگہ جگہ سے پھٹ چُکا ہے۔ خون کی دھار چہرے کی گرد کو فرض کے دامن میں جذب کر رہی ہے۔ اچانک کمرے کے باہر اولہ باری کے بیچ سے کانوں کو چھیدتی ہوئی آواز "تم غلط ...... تم غلط ...... " اُٹھتی ہے۔ دیواروں کے درمیان جہاں سڑاند پھیلی ہوئی ہے گھٹن محسوس کرتے ہوئے وہ باہر چلا آتا ہے۔ دُور دُور تک دوڑتا بھاگتا ہانپتا کانپتا ہجوم ہے جو ایک دوسرے پر پتھر برساتے ہوئے "تم غلط ...... "

تم غلط ... ...” چیخ رہا ہے۔ اسے ایک ساتھ کئی پتھر لگتے ہیں اور سر پیشانی چہرہ لہولہان ہو جاتے ہیں۔ وہ دوڑ دوڑا اندر آتا ہے۔ سڑاند کی زد میں اس کا پھیپھڑا بدبو میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ پناہ ڈھونڈتی ہوئی ابابیلوں اور سیاہ کبوتروں سے ٹکراتا گرتا پڑتا وہ پھر دو چار پتھر کھاتا ہے اور گھبرا کر بے تحاشا اندر کی طرف لپکتا ہے۔ یہاں کی بدبو کی تاب نہ لاتا ہوا پھر باہر بھاگتا ہے اور اس طرح وہ صدیوں پتھر کھاتا اور بدبو برداشت کرتا اندر سے باہر اور باہر سے اندر کی طرف ہانپ کانپ کر دوڑتا ہوا زندگی گذار دیتا ہے۔ اور اس کی ساری توانائی ختم ہونے لگتی ہے۔

دیواروں میں سمٹے ہوئے ہاتھ بہت دیر تک بے نیاز ہو کر یہ تماشا دیکھتے رہتے ہیں اور جب دروازوں پر بھی پتھر گرنے لگتے ہیں تو بوڑھے کے اندر آتے ہی دھڑاکے کے ساتھ وہ اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں۔ کچھ دیر تک وہ لہولہان سر اور منہدم ہوتے ہوئے جسم کی تکلیف بھول کر اپنے پھیپھڑوں پر بدبو کے حملوں کو جھیلتا ہے اور برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو دروازے کی طرف لپکتا ہے۔ باری باری وہ نڈھال قدموں سے ہر دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن کوئی ہاتھ اسے اپنا دروازہ کھولنے نہیں دیتا۔

اب گئے تو آنا نہیں ہوگا ... ... !

لیکن پتھروں کا حملہ ... ...

وہ سب نہیں جانتے ... ... جانا ہے تو چلے جاؤ ... ... لیکن جب تک سوگباری بند نہ ہو جائے دروازہ نہیں کھلے گا اور شاید سنگباری اب کبھی بند نہیں ہوگی ... ... !

نہیں ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا ... ... !

دروازہ کھول دو ... ... شاید کوئی پناہ ڈھونڈھنے نکلے ... ... !

اوروں کی بات چھوڑو ... ... تمھیں جانا ہو تو چلے جاؤ ... ... لیکن سنگباری بند ہونے سے پہلے آنا نہیں ہوگا ... ... !

گھٹن اور بدبُو میں اضافہ ہوچکا ہے ۔۔ ۔۔۔ اس کا سانس لینا دوبھر ہورہا ہے ۔۔۔ ۔۔۔ دیواروں پر الگ کٹے ہوئے موٹے ہاتھوں میں آکسیجن ٹیوب نظر آتی ہے جس سے وہ اطمینان کے ساتھ سانسیں لیتے ہوئے اپنی اپنی دیواروں کی نگہبانی کررہے ہیں۔ بوڑھا ان کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

مجھے بھی ۔۔۔ ۔۔۔!

باہر جاؤ ۔۔۔ ۔۔۔!

باہر بہت بارش ہورہی ہے اولے بھی گررہے ہیں اور سنگباری بھی ہورہی ہے ۔۔۔ ۔۔۔!

ہونے دو ۔۔۔ ۔۔۔!

مجھے سانس لینے میں دقت ہورہی ہے ۔۔۔ ۔۔۔!

ہوتی رہے گی ۔۔۔ ۔۔۔!

بدبو برداشت سے باہر ہے۔ ۔۔۔ ۔۔۔!

ہونہہ۔

مجھے بھی آکسیجن ۔۔۔ ۔۔۔!

ہرگز نہیں ۔۔۔ ۔۔۔ ہم نے اپنے لیے حاصل کیا ہے ۔۔۔ ۔۔۔!!

مَیں کیا کروں ۔۔۔ ۔۔۔!

کچھ نہیں ۔۔۔ ۔۔۔!!!!

سارے ہاتھ زور زور سے ہوا میں بلند ہوتے ہیں۔

تب مجھے باہر جانے دو ۔۔۔ ۔۔۔!

اب یہ بھی نہیں ۔۔۔ ۔۔۔ دروازوں پر بھی پتھر کی بارش ہونے لگی ہے ۔۔۔ ۔۔۔!

وہ ہکا بکا چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے۔

دروازہ کھولو !! ۔۔۔ ۔۔۔ مرنا ہی ٹھہرا تو کھلی ہوا میں سانس لیتے ہوئے مروں گا۔

نہیں! ... ... ہمارا وجود خطرے میں پڑ جائے گا ... ... !!!

تب میں کسی دیوار میں چھید کردوں گا ... ... !

بڈھے ہم تمھاری بوٹی بوٹی ... ... !!!

مَیں جوان ہوں اس لیے کہ بوڑھا ہوں ... ... !

تم دیوار میں چھید کروگے ... .

سارے ہاتھ حلقہ بنا کر اس کی گردن کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ وہ کئی بار ان کے حملے کو انامیت کی ڈھال پر روکتا ہے۔

گھٹن بڑھتی جارہی ہے۔ سانس لینا ناممکن ہو رہا ہے وہ بلبلانے لگتا ہے۔

تم لوگوں سے کیا جھگڑا ... ... میرا کسی سے کیا جھگڑا ... ... مَیں تو صرف جینا چاہتا ہوں ... ... کوئی بھی دیوار کھسکے اور مجھے ہوا دے ... ... کوئی دیوار کھسکے اور مجھے تھوڑی سی ہوا دے ... ... کہیں سے کوئی دیوار ٹوٹے اور مَیں سانس لے سکوں ... ... !!!

اس وقت حادثہ ہوتا ہے۔ ایک دیوار رو کنے لگتی ہے اور سراتی سرد ہوائیں زن زناتی ہوئی محبوس کمرے میں گھس آتی ہیں۔ طوفانی بارش اولہ باری اور باہر کی سنگباری کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ دیوار پوری کی پوری ڈھ جاتی ہے۔

بوڑھا دیوار کے نیچے دب جاتا ہے۔ مرتا ہے نہ جیتا ہے۔ کچھ ابابیلیں اور سیاہ کبوتر اس کے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ڈھنے والی دیوار پر منحصر کٹے ہوئے ہاتھ "ہائے دیوار" ... ... ہائے دیوار ... ..." چیختے ہوئے سینہ پیٹتے رہتے ہیں اور بقیہ سلامت دیواروں پر جمے ہوئے ہاتھ اپنی دیواروں کو بچانے کے چکر میں ان سے زوردار طریقے سے چمٹ جاتے ہیں۔

بوڑھے کی "بچاؤ ... ... بچاؤ ... ..." کی آوازیں دھیرے دھیرے ڈوبتی جاتی ہیں۔ ابابیلوں اور سیاہ کبوتروں کی دلدوز چیخیں ہواؤں میں چھید کردیتی ہیں اور پل پل کو ادھیڑ دینے والا سناٹا لمحے لمحے کو دہلانے والا شور اور یہاں سے وہاں تک ان دونوں کی زد میں کھنڈر ہوتی ہوئی زندگی تیزی کے ساتھ ابھرتی جاتی ہے۔

گربچن چندن

ایک اور سفر

سورج غروب ہو رہا تھا اور شام کے سائے اس کے صحن میں سیاہ چادر کی طرح پھیل گئے تھے۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے بڑھتی ہوئی تاریکی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دسمبر کی وہ شام کچھ اور بھی اندھیری ہو گئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وقت اور موسم دونوں ہی اس سے خفا ہیں۔

دیوار کے کلاک نے چھ گھنٹے بجائے وہ چونک پڑا اور دیکھا کہ چھ بج گئے تھے۔

چھ سال پہلے اس کی زندگی میں دوبارہ بہار آگئی تھی لیکن چار ہی دن میں ایک کے بعد دوسری کا بھی ساتھ چھوٹ گیا۔

یہ ساتھ کیوں چھوٹ گیا؟ یہ ساتھ کیوں چھوڑنا پڑا؟ یہ سب کیوں ہوا؟! انھیں سوالوں پر سوچتے ہوئے اسے چھ سال ہو گئے تھے۔

وہ چاہتا تھا کہ ان سوالوں پر سوچنا چھوڑ دے اور زندگی کو ایک نیا رُخ دے لیکن مسلسل کوشش اور والدین کی تسلیوں کے باوجود وہ یہ نہ کر سکا۔

اس کے ذہن کے کسی پچھلے کونے میں آواز دبکی ہوئی تھی۔ یہ موقع محل دیکھ کر چپ چاپ اس کے کان میں کچھ کہہ دیتی۔ اس کی بدولت اُسے محسوس ہوتا کہ وہ جانتا ہے کہ اُلجھن کیوں پیدا ہوئی جانتا ہے کہ اُلجھن کیسے دور ہو سکتی ہے لیکن ماتھے پر ایستادہ نگران

نظریہ اس خاموش آواز کو آگے نہ آنے دیتا اور اسے بار بار یاد دلاتا کہ وہ مردہ ہے۔ اپنے خاندان کا رُکن اوّل۔ وہ خاندان جس کے بزرگ شاہی درباروں اور رئیسوں میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ وہ ہر صورت میں اپنی آن قائم رکھتے اور اس سے کوئی سمجھوتہ نہ کرتے تھے۔

بزرگوں نے اس کا نام کپل کمار رکھا تھا لیکن گھر کے اس درباری ماحول میں بچپن ہی میں اہلِ خاندان اسے کمار کے نام سے بُلاتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ان کی حیثیت میں فرق آگیا لیکن پُرانی روایتوں کا تاثر قائم رہا۔ رہن سہن میں وہی ٹیم ٹام آپسی گفتگو میں وہی خود پسندی اور مہمانوں کے سامنے وہی خودستائی برتی جاتی تھی۔ اس تربیت کے سبب کپل اپنے گھر میں ایک طرح دار مہرو کی طرح تھا جس کی بول چال اور میل جول میں کروفر کا جذبہ جاری تھا۔ انجنیری کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسے جلد ہی دلّی کے قریب ایک تحصیل میں سرکاری افسر کی نوکری مل گئی تھی جس سے ان کے ٹھاٹ میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

گھر کے مغل ماحول میں وہ ایک شیخو کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔ ایک دن جب اس کے والد کسی دعوت سے ملا ہوا ایک سگار پی رہے تھے تو شیخو نے قریب آکر کہا۔ "ابّا حضور مَیں نے اپنی نور جہاں ڈھونڈ لی ہے۔ بس اب آپ کی منظوری کا انتظار ہے۔"

ابّا حضور نے حکم دیا کہ اس کے والدین کو ان سے بات کریں۔ شیخو نے کہا وہ غریب ہیں۔ انھیں یہاں آنے میں تامل ہے۔ ابّا حضور کا ماتھا ٹھنکا۔ سگار کو ایش ٹرے میں رکھ کر کپل کے پاس آئے اور اس کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ اُنھوں نے چاہا کہ وہیں کہہ دیں کہ انتخاب طفلانہ ہے لیکن معاملے کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھوں گا جب تک مَیں خود فیصلہ نہ کرلوں تم کوئی قدم آگے نہ بڑھانا۔"

اور پھر شیخو آگے قدم نہ بڑھا سکا۔ ابّا حضور کا قول گھر میں حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

تھوڑے دنوں میں اس کے والدین نے خود اس کے لیے ایک گھر ڈھونڈا کپل نے لڑکی دیکھی اور اسے پسند آئی۔ اسے اپنی سابقہ محرومی بھول گئی اور والدین کی بصیرت اور بصارت دونوں پر فخر ہوا۔

زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ ایک شاندار پالکی میں اس کے شگفتہ اور مسکراتے شباب میں داخل ہوئی۔ یہ اس کے ۲۵ سال کے انتظار کا ثمر تھا۔ لیکن اس پالکی کو اس کے والدین نے ڈیوڑھی میں ہی اُتار لیا۔ اس کی آمد کا سود و زیاں دیکھا۔ جب کپل وہاں پہنچا تو اس کے سامنے کم و بیش کا میزان رکھا گیا۔ اس کو حکم ہوا کہ صحیح منزل کے لیے ایک سفر اور کرنا ہوگا۔

پالکی لوٹا دی گئی۔ کپل اس کی پچھلی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بڑھ کر پالکی کو واپس لے آتا یا اسے لوٹ آنے کے لیے آواز دیتا۔ اُلٹا جب اس نے دیکھا کہ ممی اور ڈیڈی اپنے غور و فکر سے بے حال ہو گئے ہیں تو وہ پالکی اور پھر اس کی راہوں کو گھورنے لگا۔ گھورتا رہا اور جھلاتا رہا۔ جھلاہٹ میں اس نے چاہا کہ پالکی کو پتھر مارے لیکن وہ اب اس کی دسترس سے باہر تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ گم گشتہ رومان کا پھر پیچھا کرے۔ اپنی نورجہاں سے پھر ملے۔ اس کے ماں باپ نے اس کی حمایت کی۔ اس نے اس حمایت میں پوشیدہ کم اندیشی کو درگزر کیا۔ اور جا کر وہاں دستک دی۔ نورجہاں نے دروازہ نہ کھولا۔ کھڑکی ہی سے جواب دیا "تم عاشق نہیں بن سکتے۔ جاؤ خاوند بنو۔" شیخو نورجہاں کی نظروں سے بھی گر گیا۔

گھر پہنچا تو ڈیڈی کی وہی آواز پھر سنائی دی۔ صحیح منزل کے لیے ایک سفر اور۔ اس کی خاموش آواز نے کہا۔ تُو نے منزل پا کر اسے چھوڑ دیا۔ منزل بار بار نہیں ملتی۔

اِس نے سوچا کہ شدت آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ یہ تصورات کی ہو۔ اطاعت کی ہو۔ اندازے کی ہو۔ اپنے عمل اور اثر میں بڑی ظالم ہے۔ یہ اک ایسی جدائی پیدا

کر دیتی ہے جو زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے۔

خاموش آواز نے کہا۔ تمہاری زندگی اب دریا کے دو کناروں پر کھڑی ہے۔ دریا بہہ رہا ہے اور کنارے مل نہیں سکتے۔ تم نے خود اسے باز اپنے ہاتھوں سے چیرا۔ اب تمہاری پشیمانیاں اور بزرگوں کی دعائیں دستی کاغذ کی کشتیاں ہیں۔

خاموش آواز کہہ رہی تھی تم نہیں چاہتے تھے لیکن چاہنے لگے۔ تم نہیں کر سکتے تھے لیکن گر گئے۔ صرف ایک آواز پر تم سیندور کو خون میں بدلنے کے لیے آمادہ ہو گئے تم نے اپنی دُلہن کی مانگ میں گھائل تمنّاؤں کا خون بھر دیا۔

اس کا نگران نظریہ آگ بگولا ہو گیا“ جذبات کی اس راگنی کو بند کرو یہ خاندان کی عزّت کا سوال ہے۔ جہاں ماں باپ خوش نہ ہوں وہاں پُرکھوں کی آتما بھی سُکھی نہیں رہتی۔

خاموش آواز نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ”تم نے ان کی خوشی کے لیے کیا نہیں کیا لیکن گم شدہ مسرّت تو واپس نہیں آتی۔“

کپل نے سر کو جھٹکا میری رجائیت کہاں گئی۔ میری جرأت کہاں گئی۔ میری قوّتِ عمل کہاں گئی۔ مَیں بار بار ماضی کی طرف کیوں جاتا ہوں۔ زندگی بنانے کے لیے آگے دیکھنا ہوگا۔ آگے چلنا ہوگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو ایک دوسری میں باندھتے ہوئے کہا۔ رفیق حیات کے لیے ایک کوشش اور کرنی ہوگی۔ زندگی کے راستے کبھی بند نہیں ہوتے۔ اس نے باہیں کھولیں۔ بازوؤں کو آغوش کی شکل دی اور انتظار کرنے لگا۔ شاید اس کے ذہن کے کمرے پر کوئی دستک دے لیکن اِس اندھیرے کمرے پر کوئی دستک نہ ہوئی۔ اِس کی آغوش بنتے ہی مٹ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ رفیقۂ حیات کے لیے اسے پھر اِسی دُنیا میں جانا ہوگا جو اِس پر خندہ زن ہے۔ اسی سماج میں جانا ہوگا۔ جس سے وہ آنکھ نہیں ملا سکتا۔ وہ جب تک وہاں نہیں جاتا محفوظ ہے۔ لوگوں کی نظریں اسے گھورتی نہیں ہیں۔ ان کی آوازے اس پر اُٹھتے نہیں ہیں۔ ان کی باہمی بے خبری میں ایک عافیت

ہے اس کے تحت الشعور نے پھر کروٹ لی اور اسے محسوس ہوا کہ انسان دُنیا سے چھپ سکتا ہے۔ سماج سے دُور جا سکتا ہے۔ اپنی بیوی اور اہلِ خاندان سے علیحدہ رہ سکتا ہے لیکن اپنے آپ سے ایسا نہیں کر سکتا۔ یا اس کا سب سے بڑا مشاہد، معاون اور محتسب وہ خود ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک اور سفر کے لیے اس کے پاس وہ تصور اور ایمان نہیں ہے جو منزل کو اس کے قدموں پر ڈال دے۔ اس کی منزل دُور سے دُور تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس کی خاموش آواز موقع دیکھ کر پھر نکل آئی تم نے اسے کیوں جانے دیا۔ وہ تمہاری ۲۵ سال کی انتظار کا صلہ تھی۔ اور یاد ہے وہ واپس بھی آ گئی تھی۔ اس واپسی میں زندگی عورت اور محبت کا ایک بھرپور روپ تھا۔ لیکن تم اسے دیکھ نہ سکے۔ تمھیں جرأت ہی نہ ہوئی۔

نگراں نظریے نے سینہ تانا "تم اسے چھوڑ چکے ہو۔ سمجھوتہ تمھاری آن کے خلاف ہے۔ مردانگی مسلسل کوشش میں ہے۔"

اس نے مشورے کو زیرِ لب دُہرایا۔ پھر سوچا کہ وہ اسے چھوڑنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن اسے بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ مشورے جو اس کی پہلی کامیابیوں میں کارگر ہو گئے تھے اب حلق سے نہ اُترتے تھے۔

اس کے اندر محرومی کا احساس بیدار ہوا کہ اور آہستہ آہستہ اس پر غلبہ پانے لگا۔ لیکن بچپن کی تربیت اور لاڈ لڑکپن کی خودسری اور بہکاؤ اور جوانی کی کامیابی اور لگاڑ نے اس احساس کو مرکز پر نہ آنے دیا۔ اس نے سوچا کہ وہ برتر ہے اس لیے محروم نہیں ہو سکتا پھر سوچا کہ وہ محروم ہے اس لیے برتر نہیں ہو سکتا۔

یہ اُدھیڑ بُن اس کا مستقل روگ بن چکی تھی۔ آج کی رات تو گویا اس کے لیے قیامت لے کر آئی تھی۔

کاٹتی ہوئی تنہائی نوچتی ہوئی محرومی اور زچ کرتی ہوئی یادیں کس قدر اذیت ناک تھیں۔ وہ رو سکتا تو روتا۔ بول سکتا تو بولتا لیکن اس کی حالت اِس بچے کی سی تھی جسے سخت

تکلیف ہو اور اسے ایک تنہا اور بند کمرے میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ روتا ہو تو کوئی اس کی آواز نہ سُنے۔ بھاگتا ہوا باہر نہ آسکے۔ اور پھر وہ سسکتا سسکتا تھک جائے۔ آنسوؤں سے نم چہرے کے ساتھ گیلے بازوؤں کے تکیے پر سو جائے اور جب بیدار ہو تو پھر رونے لگے۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ صحن کے اندھیرے میں ایک ہولی گھوم رہا ہے۔ کھُلے بالوں سے ڈھکے ہوئے کسی چہرے کی آنکھیں اسے گھور رہی ہیں اور اس کی طرف بڑھتی آرہی ہیں۔ وہ اٹھا اور دروازے کے کواڑ بند کرنے لگا۔ دروازے کی دہلیز پر اسے ایک سسکتی ہوئی آواز سُنائی دی جیسے کوئی دکھی دل دھیرے دھیرے کراہ رہا ہو وہ کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ لیکن دو آنکھیں دو اُداس اور ناراض آنکھیں جنھیں وہ دیکھ نہ سکتا تھا اسے برابر دیکھ رہی تھیں۔

اس نے صحن کی طرف سے مُنہ پھیرا اور کھڑکی کی طرف پیٹھ کر لی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے بڑے صوفے پر ایک دُلہن بیٹھی ہے اور اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے۔ اس نے وہاں سے بھی نگاہیں ہٹالیں اور اوپر چھت کی طرف دیکھا۔ وہی ناراض اور اُداس آنکھیں اسے وہاں سے بھی جھانک رہی تھیں۔ وہ اُٹھا اور اندر کے دروازے سے بیڈ روم میں داخل ہو گیا لیکن وہ صوفے والی دُلہن اس سے پیشتر وہاں پہنچ گئی۔ وہ اس کے ڈبل بیڈ کے درمیان میں لیٹی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بلب نرمی سے روشن تھے اور وہ اسے اپنی بانہوں کا تکیہ پیش کر رہی تھی۔

کپل نے سر کو جھٹکا "میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ میں اسے پیار نہیں دے سکتا" وہ بڑبڑایا۔ میں اس پتنگ کی مانند ہوں جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

اِس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ روشنی بجھ گئی۔ وہ واپس کھڑکی کے پاس گیا بند آنکھوں میں وہ اور زیادہ نظر آنے لگی جیسے اس کے پہلو میں بیٹھی ہو۔ اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں سے سگریٹ اُتار کر ایش ٹرے میں دبا رہی ہو۔ اِس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور سگریٹ سُلگا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

دھوئیں کے حلقوں میں کئی تصویریں بننے لگیں۔ وہ صبح کی چائے لا رہی ہے۔ کوئی دلچسپ خبر سُنا کر اخبار پیش کر رہی ہے۔ ناشتہ کی اشیاء کا ذائقہ پُوچھ رہی ہے۔ کوئی اِس کی نکٹائی کی گرہ کو سیدھا کر رہی ہے۔ اس کی جیب میں رومال لگا رہی ہے۔ کلائی پکڑ کر مُسکرا رہی ہے اور میٹھے نرم لہجے میں پُوچھ رہی ہے۔ "دفتر سے کتنے بجے لَوٹ آؤ گے؟"

"مَیں نہیں آؤں گا۔" کپل نے گھبرائے اور سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

کلاک نے دو بجائے۔ اسے محسوس ہوا کہ کلاک کی آواز میں اس کی شکست اور ندامت کا اعلان ہے اس نے سوچا وہ جا کر سو جائے۔ شب بیداری سے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نہ نیند تھی نہ ذہن میں چین۔

اس نے ایک اور سگریٹ سُلگایا اور ڈائری لکھنے لگا۔ ٹھٹھری ہوئی فضا میں دھوئیں کے حلقے اس کے ماتھے پر یلغار کرتے رہے ان حلقوں کے جھروکوں سے وہ کبھی کبھی کلاک کی طرف دیکھتا۔ اس کی نظریں ان خطوط پر جم جائیں جو اس نے کلاک کو صحیح مقام پر رکھنے کے لیے کھینچے تھے۔ یہ راستی کے نشان ہیں۔ ہمارے آئینہ وقت کو یہیں جم کے رہنا چاہیئے۔ اسے اس کے الفاظ یاد آئے۔ اسے محسوس ہوا کہ کلاک کی ٹِک ٹِک میں اس کی سانسوں کا ایک ساتھی ہے۔

اس ساتھی کے ساتھ اس نے باقی رات آنکھوں میں گُزار دی۔

کلاک نے آٹھ بجائے۔ نئے سُورج کی روشنی جو پہلے اس کے صحن میں دبے پاؤں آتی تھی اب اطمینان سے اس کے کمرے میں داخل ہو چُکی تھی۔

اس نے دیر سے سُلگتے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑا۔ ڈائری کو میز پر رکھا اور ایک لمبی انگڑائی لی۔

وہ کچھ اونگھنے سا لگا اور پھر یہ سوچتے ہوئے کہ آج اتوار ہے اور دفتر جانے کا کوئی

جھمیلا نہیں صوفے ہی پر دراز ہو گیا۔

اسی اثنا میں اس کے والد وہاں پہنچے۔ انھوں نے بیٹے کو سوتے ہوئے دیکھا تو کمرے میں چپ چاپ داخل ہو کر اس کے بڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔

معاً کپل کی آنکھ کھلی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس صوفے پر جہاں وہ رات بھر اپنی دلہن کو دیکھتا رہا تھا صبح سویرے اپنے والد کو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"آپ یہاں کیسے؟ میرا مطلب ہے کب آئے" اپنی ذہنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ والد نے اسے اٹھا کر اپنے پاس بٹھایا اور دیر تک اس کی بوجھل آنکھوں اور خشک چہرے کو دیکھا۔ پھر بڑی شفقت سے کہا۔

"یہ تصویر دیکھو۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ گھر بھی بہت اچھا ہے۔ تمھاری ممی اور میں نے اسے پسند کر لیا ہے۔ اب تم چل کر دیکھ لو۔"

کپل یک لخت کھڑا ہو گیا اور درد و کرب سے پکارا۔ "ڈیڈی مجھ سے یہ نہیں ہوگا نہیں ہوگا۔" اور سسکیاں بھرنے لگا۔

اس کے والد کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ وہ بھانپ گئے کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ انھوں نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کپل ماضی کو بھول جاؤ اور اس پیش کش کو تھام لو۔"

کپل کی چیخ نکل گئی۔ اس نے تصویر کو گھورا۔ دو قدم آگے بڑھا۔ والد سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن زبان نہ کھل سکی۔ اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

جیلانی بانو

چابی کھوگئی

ایک چھوٹی سی چابی تھی۔

میز کے خانے میں ایک چھوٹی سی ڈبیہ کے اندر رکھی تھی۔

کئی بار میں نے یاد کیا۔ یہ چابی کس تالے کی ہے میری میز کے خانے میں دوا کی خالی ڈبیہ میں کہاں سے آئی۔؟

پھر سوچا۔ چابی ہمیشہ حفاظت سے رکھنا چاہیئے۔ کوئی نہ کوئی قفل اس سے کھل ہی جاتا ہے۔ پڑا رہنے دو۔ کیا پتہ۔ میری آتما کی طرح کسی اور قفل کے اندر بھی بہت سارے بھید خواہشیں شک اور اندیشے بند ہوں کسی کنجی کے انتظار میں۔ میں جو ایک زمانے سے کھوج رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ میرے اندر کیا ہے۔

یہ جو لوگ میرے سامنے بیٹھے ہیں ہنس رہے ہیں رو رہے ہیں۔ کیا واقعی ہنسی ان کے دل کے جھرنوں سے پھُوٹ رہی ہے۔ کیا واقعی آنسو ان کے دل میں چھُپے ہوئے تھے۔

مَیں ان کے دِلوں میں کیوں نہیں جھانک سکتی۔ مَیں انسان کے بدن کو چیر کے اس کی آتما کو کیوں نہیں دیکھ سکتی۔ اپنی اِس بے لبسی پر مجھے جھنجھلاہٹ سی ہوتی ہے اور غصّہ بھی آتا ہے۔ بعض وقت جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ دوں۔ ڈاکٹری کی پڑھائی اور ادویش

کی محبت ماں کا ایثار۔ اس زندگی کے معنی آخر کیا ہیں۔ بعض باتیں کتنی ناقابل فہم اور حقیقت سے دور لگتی ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ ـــــ بس یہی میں کھوجنا چاہتی ہوں۔

اس وقت جب میں اودیش کی محبت میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ اس کے سارے وعدوں دعووں اور خواہشوں کو مانتے وقت بعض وقت یہ باتیں مجھے عجیب سی لگتی ہیں۔ ہر وقت اودیش کے خیال میں کھوئے رہنا زندگی کے ہر دور میں ہر دن میں اسے شامل کرنا۔ یہ کتنا بڑا کام تھا۔ کتنا مشکل کام اور میں نے کتنی آسانی سے اپنی تمام چابیاں اودیش کو تھما دی تھیں یہ ایک ایسے لاابالی لڑکے کو جو بقول ممی بالکل ناسمجھ تھا۔ جو نہیں جانتا تھا کہ زندگی کے سارے دن ایسے روپہلے چمکیلے نکیلے نہیں ہوں گے جیسے اب ہیں۔ مگر میں نے تو یہ کبھی نہیں سوچا اپنی اور اودیش کی محبت کو تولنے کے لیے کبھی ترازو نہیں اٹھائی۔ اس کے باوجود میرا دل شک سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے یہ سب ڈھونگ ہے۔ فراڈ ہے۔ اس دنیا سے اس چھل کپٹ والے سنسار سے میرا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ جب تک میں انسان کے دل کو نہیں دیکھوں گی میرا اودیش سے بھی کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ جس وقت وہ میرے پاس ہوتا ہے۔ مجھے اپنی محبت کا سو سو طرح سے یقین دلاتا ہے تو میں اور وسوسوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ آخر میں یہ کیسے سمجھوں کہ اودیش کے دل میں صرف میں ہوں۔ اس کی تو ہر چیز بند پڑی ہے۔ ایک چابی کے انتظار میں جو نہ جانے کس میز کے خانے میں سو رہی ہے۔

میڈیکل کالج کے ڈاکٹر سوری نے ایک بار ڈس سیکشن ہال میں ہم سے کہا تھا ”مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اس کے باوجود ان کے جسموں کا خون ان کی فطرت کا فرق بن جاتا ہے اور یہیں سے انسانی جسم پر ریسرچ کو الگ الگ کیا جاتا ہے۔“

ہال میں بیٹھے ہوئے ہم سب لڑکے لڑکیاں منہ اٹھائے ڈاکٹر سوری کے نوٹس لے رہے تھے۔

”اگر آپ کسی مرد کا بدن کھول کر دیکھیں تو ـــــ

اور مَیں کانپ اُٹھی

کیا مَیں اودیش کا ڈس سیکشن کروں۔ اس کا دل کھول کر دیکھوں۔ اس رات میں بار بار اودیش کے بدن پر نشتر چلاتی رہی ڈاکٹر سوری کے بتائے ہوئے تمام نشانوں کو مَیں نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں والی اُنگلیوں سے ٹٹولا۔ مگر مجھے کچھ نہ ملا۔

”جب مَن کی آنکھیں کھُل جائیں تو آتما کو شانتی مل جاتی ہے۔“

یہ بات ایک بار مَیں نے اپنی دادی سے سُنی تھی۔

مَن کی آنکھیں میں بھی اپنی مَن کی آنکھیں کھولوں گی تاکہ سب کا مَن دیکھ سکُوں۔ ارودیش کا دل دیکھ سکوں۔ جانے مَیں اس میں ہوں بھی یا نہیں۔

اور کیا ”مرد کی محبت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ صرف زبانی محبّت کا ڈھونگ رچا رہا ہو اور اس کے دل میں کوئی اور سُرخ گلاب جیسی عورت بسی ہو۔

مَیں ڈاکٹر کیسے بنوں گی جب تک انسان کے دل کا بھید نہ جانوں۔ مَیں کسی کا روگ کیسے مٹاؤں گی۔ کیا اوپری دواؤں سے انسان کا دُکھ دُور ہو سکتا ہے۔

لیکن مجھے مَن کی آنکھیں کھولنے والی چابی کہیں نہ ملی۔ —— سارے کونے ٹٹول ڈالے۔ مکڑیوں کے جالے بھرے اندھے کنوؤں میں کھوجتی پھری اور پھر ایک رات یوں ہوا کہ مَیں سوتے سوتے سے چونک پڑی۔ یوں لگا جیسے نور کا ایک ہالہ مجھے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ بڑی سنہری روپہلی سی رات جگمگا رہی تھی اور میرے سامنے ہر چیز انلارج ہو کر بے حد صاف شفّاف ننگی دھڑنگی موجود تھی۔ مَیں اپنے بستر سے اوپر اُٹھنے لگی۔ چاروں طرف دیکھا۔ ہر چیز کی تہ کو، اس کی حقیقت کو جو میرے سامنے عیاں تھی۔ اپنے تمام لبادے اُتارے ہوئے۔

مجھ میں اب ایک بے پناہ طاقت آچکی تھی کیونکہ میری آنکھوں کی جوت آج ہزار گنا بڑھی ہوئی ہے۔ اب میں ہر چیز کے اندر کا حال دیکھ سکتی تھی۔ اس گھڑی کے

اندر کیا بھید ہے جو یہ مسلسل حرکت کیے جارہی ہے۔ میرے پاس والے پلنگ پر ممی سو رہی تھیں۔

میری ممی جو اٹھارہ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھیں مگر اس کے بعد انھوں نے کسی مرد کی طرف نہیں دیکھا۔ بس مجھے پالنے میں لگی رہیں۔ روز صبح پوجا کے بعد ممی ایک سُرخ گُلاب ڈیڈی کے فوٹو کے پاس رکھ دیتی ہیں بعض وقت میں گھبرا کے سوچتی ہوں کہ کہیں یہ ممی کا روٹین تو نہیں بن گیا ہے۔ روز ایک گلاب فوٹو کے پاس رکھنا۔ کیا سچ مچ ممی اس ڈیڈی کے خیال کو سینے سے لگا کر سوتی ہیں جو صرف اٹھارہ برس کی عمر میں ممی کو اکیلا چھوڑ گئے۔ آج میں ممی کے اوپر پھیلا ہوا بلانکٹ اٹھا کر دیکھوں گی میں بستر سے اُٹھی ـــــ اندھوں کی طرح۔ آج میری آنکھیں دنیا کی تلخ حقیقتوں کو دیکھنے کے خیال سے جل رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں دلوں کو کھوجنے والی چابی آگئی تھی۔

نہیں ـــــ میں نے ممی کے بلانکٹ کو چھو کر چھوڑ دیا۔

میں سب سے پہلے اودیش کو دیکھوں گی کیونکہ میں نے اپنے دل میں اسے بند کر کے چابی ایک میز کے خانے میں رکھ دی ہے کیونکہ میں نے زندگی بھر کے لیے اس کی ہو جانے کا وعدہ کیا ہے۔ جس طرح میں نے سدھو سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ سدھو کتنا خوفناک لگتا ہے۔ درندوں کی طرح۔ جیسے موقع ملتے ہی پھاڑ کھائے گا۔ بعض لوگوں سے جانے کیوں آپی آپ ڈر لگتا ہے۔ یہ ڈر کہاں سے آتا ہے۔ کیوں آتا ہے۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ ایک بار مجھے کلاس میں سدھو سے پن لینا پڑا تھا دوسرے دن وہ پن لینے آیا تو میں نے بلاؤز کے گریبان کو ٹٹول کر کہا۔

" شاید میں گھر بھول آئی۔ تمھیں یاد ہے کہ کل میں نے کون سا بلاؤز پہنا تھا اور سدھو نے بڑی کٹیلی طنزیہ نظروں سے دیکھ کر کہا تھا۔"

"نہیں۔ اگر یاد رکھتا تو وہ یاد بھی کہیں کھو جاتی۔"

اس دن مجھے خیال آیا کہ میز کے خانے میں رکھی ہوئی چابی کہیں سدھو کی نہ ہو۔ شاید اسے بھی بھول جانے کی عادت ہو جبھی تو آئے دن نئی نئی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا ہے اور پُرانی دوستوں کو جیسے پہچاننا بھی مشکل ہے۔ اس کے لیے کبھی قیصر کے ساتھ ہے کبھی روپا کے ساتھ۔ انجم کہتی ہے مجھے تو سدھو کی داڑھی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔

اس لیے کالج میں داخل ہوتے وقت ایک دن میں اودیش سے لپٹ گئی تھی۔

"وہ دیکھو۔ سدھو آرہا ہے۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"میں تمھارے ساتھ ہوں ——" اودیش نے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"اپنے راستے جانے والوں سے ہمارا کیا کام۔"

لیکن آج میں اودیش کو دیکھوں گی۔ اپنے من کی آنکھوں سے۔ معلوم تو ہو کہ میں اس کے دل میں ہوں بھی یا نہیں۔

اب میں اپنی آنکھیں بند رکھوں گی اور صبح سب سے پہلے اودیش کو دیکھوں گی۔

مگر جانے کیا بات ہوئی۔

اُجالا پھیلا تو ہر چیز غائب ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کی غیر معمولی جوت۔ نور کا ہالہ، ہر چیز ختم ہو گئی تھی۔

اور میں وہی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی لڑکی گوگلز لگائے کالج کی طرف جا رہی تھی تو میرے ساتھ لوگوں کا ہجوم تھا۔ سائیکلوں پر۔ کاروں میں۔ پیدل۔ سب اپنے دلوں میں ہزاروں بھید چھپائے چہرے پر جھوٹے رنگ ملے چل رہے تھے۔

ہاسٹل آئی تو کوری ڈور میں سدھو کھڑا ایک میگزین دیکھ رہا تھا —— آخ تھو —— میں فوراً لائبریری کی طرف مُڑ گئی تاکہ دوسرے راستے سے اندر جاؤں۔

بعض وقت جانے کیوں ایسا گمان ہوتا ہے جیسے کوئی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے کوئی ہمیں گھورے جا رہا ہے۔ اب پلٹ کر دیکھیں گے تو کوئی سامنے کھڑا ہو گا اور ہمیشہ

ایسا ہی ہوا۔ جب بھی میں نے پلٹ کر دیکھا اودیش آرہا تھا۔ جب نظریں اٹھائیں اور پیش نظر آیا۔ اودیش یوں لگتا جیسے وہ میری رگوں میں خون بن دوڑ رہا ہے۔ ایک دن میں اسے من کی آنکھیں کھول کر دیکھوں گی اپنی آتما کی شانتی کے لیے۔ جس دن میرے من کی آنکھیں کھلیں گی مَیں دوڑی ہوئی اس کے پاس جاؤں گی۔ ایک مرد کے دل کا ڈس سیکشن کرنے تاکہ میری بے قرار آتما کو شانتی مل جائے۔ اس طرح میں ساری دنیا کو پہچان لوں گی، ہر چیز کی حقیقت جان لوں گی۔

"آپ بتائیے اس مرض کی اصل وجہ کیا ہے۔"

ہاسپٹل میں ڈاکٹر باری ہماری پریکٹیکل کلاس لے رہے تھے ہمارے سامنے میز پر چودہ پندرہ برس کا لڑکا لیٹا بڑی مایوسی سے دیکھ رہا تھا میں نے گلے میں پڑا ہوا اسٹیتھسکوپ اس کے سینے پر رکھا اور اچانک مجھے دھکا سا لگا۔ میرے چاروں طرف نور کا ایک ہالہ سا پھیلنے لگا۔ سنہرے روپہلے تارے سے جگمگارہے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی ڈیٹول کی ناگوار بو ایک مدہوش سی خوشبو میں بدل گئی تھی۔ ہر چیز جیسے انلارج ہو کر میرے سامنے کھلی پڑی تھی۔

میرے من کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ میں لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے دل میں زندگی کی خواہش ایک دیئے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ لیکن موت اس کے قریب کھڑی تھی۔

"ڈاکٹر اس مرض کا نام ہے زندگی کا یقین ـــــ اسے یقین دیدو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

اور مَیں وہاں سے بھاگی۔ اودیش کو ڈھونڈھنے۔ پاگلوں کی طرح میں نے ایک ساتھ کئی کئی سیڑھیاں پھلانگیں۔

بڑے ہال میں سدھو کھڑا تھا۔ ایک اینگلو انڈین لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے شاید اسے جنم جنم ساتھ دینے کا یقین دلا رہا ہو۔ اس نے اپنی لمبی داڑھی کو سیاہ جالی سے باندھ رکھا تھا اور بند گلے والا سُرخ سوئٹر پہنے تھا لیکن ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں اس کی آتما کو مَیں نے دیکھ لیا ـــــ اس کا دل سورج کی طرف میرے سامنے روشن

تھا اور اس کے اندر انجم کھڑی تھی ـــــ انجم جو سدھو کی طرف دیکھ کر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔

دیکھا ـــــ آج کیسے کیسے بھید عیاں ہو رہے ہیں ـــــ

اور وہ کہاں ہے۔ اودیش ـــ اودیش یہاں ہے ـــ کیا اودیش آیا ہے۔ میں سارے ہاسپٹل میں بھاگتی پھر رہی تھی۔

کیا ہوا ـــ کیا ہوا ـــ

میرے پیچھے لڑکے لڑکیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا وہ سب حیران تھے کہ آج میں دیوانوں کی طرح اودیش کو کیوں ڈھونڈھ رہی ہوں حالانکہ میں نے اپنے اور اودیش کے پیار کو سارے میڈیکل کالج سے چھپایا تھا۔ ہم بظاہر صرف دوستوں کی طرح ملتے تھے لیکن آج میں اودیش کے دل میں چھپی ہوئی شبیہہ کو دیکھ لونگی۔

"آج اودیش ہاسپٹل نہیں آیا۔"

ہے بھگوان ـــ کب کیا کروں ... ... اتنے لوگوں سے کیسے پیچھا چھڑاؤں گھبرا کے میں ٹائلٹ روم میں گھس گئی۔ سامنے بہت بڑا آئینہ تھا اور اس کے اندر میں کھڑی تھی ـــ سورج کی طرف واضح۔ زمین سے آسمان تک انلارج کی ہوئی۔ میرا دل سُرخ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا اور اس کے بیچ میں سدھو کھڑا تھا ـــ لاپروا ـــ بے مہر ـــ خوفناک ـــ

رات کو میں نے گھبرا کے جلدی جلدی میز کا خانہ کھولا اور دوا کی ڈبیا باہر نکالی مگر وہ چابی کہیں کھو گئی تھی ـــ

رتن سنگھ

رگِ سنگ

اس کے پاؤں کے پتھر پر مٹی کرب جمنا شروع ہو گئی تھی، اس کا احساس تو اس چٹان کو نہیں ہو پایا تھا، لیکن جس دن اس مٹی کی تہہ ذرا سی پھوٹی اور اس میں سے کوئی ہری سی چیز نمودار ہوئی تو چٹان کو خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ جاننے کے لیے تجسس بھی بڑھا کہ آخر یہ ہے کیا چیز؟ کوئی ہیرا ہے یا نگ ہے؟ یہ اس کے اپنے اندر سے پھوٹ کر باہر نکلا ہے یا کسی ہوا کے جھونکے کے سہارے اُڑتا اُڑتا باہر سے آ کر گرا ہے؟

لیکن دوسرے تیسرے روز ہی جب چٹان کو یہ پتہ چلا کہ یہ کوئی ہرا پودا ہے جو اُس کی اپنی کوکھ سے اُگ کر بڑا ہو رہا ہے تو جیسے اس کے بے جان ریشوں میں جان آ گئی۔ ہرا پودا جو اس کی ہستی کا ایک حصہ تھا وہ اس کے لیے ہیرے اور نگ سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔ اس لیے اس کے سارے وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اس کا سارے کا سارا پتھر وجود ممتا کے مارے پانی میں ڈھل کر اس پودے کو سینچنے کے لیے بے چین ہو اُٹھا۔ لیکن وجود کی مجبوری اس کی پانی پانی ہوئی۔ ممتا کو پتھر کئے دے رہی تھی۔ سخت، بے حس، بے جان پتھر کی چٹان، جو نہ ہل سکتی ہے، نہ بول سکتی ہے اور جس کے تمام لطیف احساسات اس کے وجود میں پتھر ہو کے پڑے رہتے ہیں۔

لیکن اس پر بھی اس چٹان نے خوشی اور فخر سے اپنا سر اُونچا اُٹھا کر اپنے ساتھ ہی کھڑے پہاڑ کی بلند اور سب سے اُونچی چوٹی کی طرف دیکھا، جس کا کبھی وہ حصّہ تھی۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتی ہو۔ دیکھو دیکھو میرے ہاں پَودا ہوا ہے۔ دیکھو میں ماں بنی ہوں۔ ذرا نظریں جُھکا کر نیچے دیکھو۔ یہ پَودا کتنا نرم و نازک ہے۔ اُن بادلوں سے بھی زیادہ نرم و نازک جو تمھارے گرد اکثر منڈلایا کرتے ہیں۔

دراصل یہ چٹان خود کبھی اس بلندی کا حصّہ تھی جس کی طرف وہ اس وقت دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنے برس پہلے، شاید سینکڑوں، شاید ہزاروں برس ہوتے جب کوئی زلزلہ آیا تھا اور وہ ایک دھماکہ کے ساتھ اس بلندی سے گر پڑی تھی۔ تب سے وہ ہمیشہ حسرت سے اس بلندی کی طرف دیکھ دیکھ کر آنسو بہانے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن پھر وہی مجبوری۔ اس کے آنسو بھی پتھر بنے اس کے وجود سے ہی جُڑے رہ جاتے تھے۔ اور وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی تھی کہ اس بلندی سے نیچے گر کر اس کی ہستی کسقدر بے معنی اور چھوٹی ہو گئی تھی۔ جب وہ اس بلندی کا حصّہ تھی تو بادلوں کے پرے کے پرے اُڑتے ہوئے آتے اور ان سے اٹکھیلیاں کرتے کرتے اس کا وجود خوشی کے مارے بھیگ بھیگ جاتا اور پھر اپنے سے نیچے پہاڑیوں کو دیکھ کر اُس کو اپنی بُلندی جب اسے عظمت کا احساس دلاتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود اُونچے آسمان کا ایک حصّہ ہے اور اس کا وجود بھی دوسروں کے لیے ستاروں کی طرح چمک رہا ہے۔ ایسے لمحوں میں اپنے آپ کو ستاروں سے گِھرا ہوا پا کر اس کا سَر فخر سے تن جاتا تھا، اور بلند ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ تو سب پُرانی باتیں ہیں، اتنی پُرانی کہ اُن کی یادیں بھی دُھندلی ہو گئی ہیں، اب اُسے یاد نہیں آتا کہ بادلوں کی نرمی کیسی ہوتی ہے۔ اب تو بادل آسمان کی دُوری سے برستے ہیں اور وہ اپنے آنسوؤں میں نہا نہا جاتی ہے۔ اب اُسے یاد نہیں پڑتا کہ ستاروں کے بیچ میں رہ کر کتنا اچھا لگتا ہے۔ اب تو اس کی تمام خوش گوار یادوں پر سینکڑوں سالوں کے لمحوں کی دھول اَٹ گئی ہے۔

لیکن جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دکھ، اپنے غم عزیز لگنے لگتے ہیں، اسی طرح اس چٹان کو بھی اب یہ وقت کی دُھول اچھی لگنے لگی ہے۔ کیونکہ اسی دُھول کی باریک تہہ میں سے، جو اس کے قدموں میں جم گئی ہے، وہ ہرا پَودا اُگ آیا ہے۔ اس ہرے پَودے کے وجود نے جیسے اس کی پتھر

سی رُوکھی اور پھیکی زندگی کو ایک نیا رنگ عطا کر دیا ہے۔ زندگی کا رنگ۔

اور وہ چٹان اس پودے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ پودا ابھی ننھّا سا ہے۔ اتنا سا جتنا چنے کو رات بھر بھگو دینے سے انکُر پھُوٹ آئے۔ چٹان کو یہ ننھّا سا پودا ایسے لگتا ہے جیسے اس کی گود میں نوزائیدہ بچّہ آگیا ہو۔ نرم و نازک انگوں والا بچّہ، جس کو گرمی سے بھی بچانا ہوتا ہے اور سردی سے بھی۔ دن کے وقت جب پودے پر دھُوپ پڑ رہی ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہیں اس کو یہ گرمی جھُلس نہ دے۔ رات کو سردی ہوتی ہے تو سوچتی ہے یہ پالا اس کو نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن پھر وہی وجود کی مجبُوری۔ جب کچھ نہیں کر سکتی تو سوچتی ہے جس نے دیا ہے وہی اُس کی رکھوالی بھی کرے گا۔ اور پھر اس کی نظریں آسمان کی طرف اُٹھ کر پودے کی زندگی کے لیے د [illegible] گنے لگتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ تصوّر میں سُنہرے سپنے بُنتی ہوئی وہ سوچنے لگتی ہے کہ ایک دن یہ پودا بہت بڑا تناور درخت بن جائے گا، اتنا بڑا کہ اس کے میٹھے سائے میں اسے وقت کی کڑی دھُوپ چھُو بھی نہیں سکے گی۔

ان منّتوں کے ساتھ ساتھ وہ پودا بڑا ہونے لگا۔

دِن گِن گِن کر وہ ایک اِنچ لمبا ہوا۔

پھر پل پل گِن گِن کر وہ دو اِنچ لمبا ہوا۔

پہلے اس کا ایک پتّا تھا۔ پھر دو ہوئے، اور پھر دو سے چار ہو گئے۔

اُن چار ننھّے ننھّے پتّوں کی ہریاول ہی بھلا کتنی۔ لیکن اس چٹان کے لیے تو وہ چار پتّے، چار ہزار پتّے تھے، چار لاکھ پتّے تھے، چار کروڑ پتّے تھے اسلئے وہ تو یہ سمجھتی تھی کہ اس ہریاول سے اس کا اپنا رنگ بھی ہرا ہونا شروع ہو گیا ہے اور اب وہ دوسری پتھر کی چٹانوں سے بالکل مختلف بھی ہے اور برتر بھی۔

اور پھر ایک دن صبح ہوتے ہی جب چٹان نے یہ دیکھا کہ ان چار پتّوں کے بیچوں بیچ ایک ننھّا سا خوش رنگ پھُول کھِل آیا ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اب ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے انگ انگ ذرّے ذرّے پر پھُول کھِل آئے ہوں اور اس کا سارا وجود ان پھُولوں کی خوشبُو سے مہک اُٹھا ہو۔ اور اس کا وجود کیا، اس چٹان نے تو یوں محسوس کیا جیسے ساری وادی میں وہ مہک بکھر گئی ہو۔

اس پر خوشی کی بات یہ تھی کہ پھول کے لگتے ہی وہ پودا چٹان کی طرف جھک آیا تھا۔ ویسے تو جب سے وہ پودا پیدا ہو کر بڑھنا شروع ہوا تھا تب سے اس کا دل کرتا تھا کہ وہ اس پودے کو چھو کر دیکھے۔ اس کی نرمی کو محسوس کر کے دیکھے۔ لیکن ہائے رے وجود کی مجبوری۔ یہ خواہش اس کے وجود میں مچل کر رہ جاتی تھی اور وہ اس بات سے مطمئن ہو لیتی تھی کہ آخر وہ پودا ہے تو اس کے پاؤں کے اوپر ہی اُگا ہوا اس کے وجود کا حصہ۔ لیکن اب جب وہ پودا پھول سمیت چٹان کی طرف جھک گیا تو یہ خواہش اور تیز ہو گئی۔ پھول ذرا سا ہلتا تو چٹان یوں محسوس کرتی جیسے اس کا بچہ ہمک ہمک کر اس کی گود میں آنے کے لیے مچل رہا ہو۔

اسے اب اس چٹان کی خوش قسمتی ہی کہیے کہ اِدھر اس کے دل میں اپنی کوکھ سے جنے اس پھول کو چھونے کی، گود میں لینے کی خواہش پیدا ہوئی اور اُدھر ہوا چلنے لگی۔ ہوا کے ذرا تیز ہوتے ہی وہ پودا جھوما اور دوسرے ہی لمحے چٹان کو اس پھول کا پہلا بوسہ ملا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ زندگی پے در پے اس پر نچھاور ہو رہی تھی۔

اسے ایسا لگا جیسے زندگی نے آگے بڑھ کر کوئی جادو جگایا ہو۔ کوئی سحر پھونک دیا ہو اور جس کے جادوئی اثر سے لاکھوں مُردہ چیزوں میں زندگی کی رَو دوڑ گئی ہو۔ جیسے بھگوان رام کے چرن چھوتے ہی پتھر بنی اہلیا صدیوں بعد زندہ ہو گئی تھی، اس طرح اس پھول کا لمس پاتے ہی وہ چٹان بھی زندہ ہو گئی۔

لیکن ہماری زندگی میں دُکھ تو صدیوں لمبے ہوتے ہیں، اتنے لمبے اور اذیت ناک کہ زندگی پتھر ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور سُکھ؟ ان کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب آئے اور کب چلے گئے۔ اس چٹان کو جب زندگی ملی تو ساتھ ہی اس کی جھولی میں زندگی کے شراپ بھی پڑ گئے۔

وہ ہوا جو چلی تھی اپنے پیچھے پیچھے آندھی اور طوفان بھی لائی تھی۔ اس دن مینہ بھی برسا اور اولے بھی گرے۔ اور بارش اپنے ساتھ بہا لے گئی اس ساری مٹی کو جو اس چٹان کے پاؤں میں نہ معلوم کب سے جم رہی تھی۔ اور ساتھ بہا کر لے گئی اس پودے کو، پودا جو اس چٹان کے لیے زندگی کا پیغام لے کر آیا تھا۔

اور جب رُوح پرواز کر جائے تو پھر یہ جسم بھی خاک کی مٹھی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پَودے کو پُھول سمیت اپنے وجود سے الگ ہوتے دیکھ کر اس چٹان پر جیسے گاج گری اور ساتھ ہی اس کی بھی جان نکل گئی۔ اس وقت اتنے زور کی بجلی کڑکی کہ چٹان کے بھی پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ جگہ جہاں پر وہ ہزاروں سالوں سے آڑھی ٹیڑھی کھڑی تھی، وہاں سے لڑھکی اور نیچے گہری کھڈ میں گر کر منوں مٹی کے نیچے دَب کر رہ گئی۔

جہاں وہ چٹان دبی ہے اس کے اوپر اب بہت سے پَودے اُگ آئے ہیں اور اِن پَودوں پر نِت نئے پُھول کِھلتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کے دل میں اس چٹان کے لیے بڑی عقیدت ہے جس نے کبھی اپنی بے جان پتھر کی کوکھ سے ایک خوشنما پُھول کو جنم دیا تھا۔ اسی لیے اس کی قبر پر وہ ہزاروں پُھول ہر روز نچھاور کرتی رہتی ہے۔ ایک کونے پر ایک پیڑ بھی اُگ آیا ہے۔ اس کی جڑیں زمین میں دبی چٹان پر جا کر یوں پھیل گئی ہیں جیسے زندگی اس کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اور وہ چٹان منوں مٹی کے نیچے دبی ہے۔ اُسے اپنے اُوپر اُگے پُھولوں کی مہک ملتی ہے اور نہ لمس۔ نہ ہی کونے پر اُگے پیڑ کا سایہ ہی اسے ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے صرف یہ احساس ہی مسرت کا باعث ہے کہ آخر اس کے اُوپر پُھول کِھلے تو ہیں۔ اس کے وجود سے دور ہیں تو کیا؟ لیکن آخر اُگے تو اُسی مٹی پر ہیں جس کے نیچے وہ دبا ہے۔

اور یہ احساس کچھ اس قسم کا احساس ہے۔ جیسے ہماری زمین یہ سوچے کہ میں جاندار نہیں ہوں تو کیا' آخر کروڑوں جانداروں کو زندگی میں ہی تو عطا کرتی ہوں؟

اقبال متین

کونپل سے پُرزے تک

سڑک نے جیسے اس کے قدم پکڑ لیے ——— مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی۔

وہ ٹھٹک گیا۔ پھر کسی سوئی ہوئی یاد نے انگڑائی لے کر چٹکی لی۔

یہ تو وہی سڑک ہے جس پر میرا چھوٹا دادا تارا نگر سے پیلی جوار گدھوں پر لاد کرے آیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں ہمارے گاؤں میں قحط پڑ گیا تھا۔ میں بھی چھوٹے دادا کے ساتھ تھا۔ اس کی مدد کی تھی۔ اپنے سر پر ایک ننھی سی گٹھڑی میں نے بھی اُٹھا رکھی تھی۔

جتندرا نے اس سے کہا ——— تمھیں معلوم ہے اسی سڑک سے ناگپور کے مزدور اپنے ساتھ کئی سو گدھوں کا قافلہ لیے زمین کو ہموار کرنے کے لیے آئے تھے۔ زمین کھودی جاتی تھی تو مٹی کو دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے اپنے گدھوں سے کام لیتے تھے۔ اور واقعی اس سنگلاخ زمین پر فیکٹری کی بنیا رکھنے میں ان مزدوروں کا بڑا حصہ ہے۔

وہ چالیس سال کے بعد اپنے گاؤں لوٹا تھا۔

ماضی تو کسی مرحوم دوست کی مانند ہے۔ اس کی قبر پر پہنچو تو اپنی یادوں کو سمیٹ کر جیسے جاگ اٹھتا ہے۔

جب وہ شہر سے چلا تھا تو کتنے ہی چہرے اس کے ذہن میں ہیولی بن کر بیدار ہوئے تھے پھر ان کے خد و خال آہستہ آہستہ واضح ہوئے پھر وہ آنکھوں کے سامنے جیسے مجسم ہو گئے۔

چیچا، پنٹلو، بڑے جنت دادا کا نسے اور پیسے کی گولیوں والا اُنچا، گلی ڈنڈے والا رحمان ریڈی بنوٹ والا پاپیا، جس سے اس کی کُٹّی رہتی تھی، جوان اور خوبصورت لیکن بیوہ ماں اور پھر مچھلیوں سے بھرا گھنے سایوں سے ڈھکا چھوٹا سا تالاب، زندہ سید کی اونچی سی قبر۔

تم تو ابھی سے اپنے گاؤں والوں میں کھو گئے ہو۔

جتندرا کہہ رہا تھا ـــــ یہی جذباتی لگاؤ جو تمہیں گاؤں والوں سے اور گاؤں والوں کو تم سے ہے وہ یقیناً ہماری بات کو موثر بنا سکتا ہے ـــــ اور وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنے گاؤں کے باسیوں کو آزادی کی نعمتیں اور برکتیں بتلانے چلا تھا۔

”من مول“ کا سارا گاؤں رام چندرا پورم کے ہیوی الکٹریکلس پلانٹ کے زیر اثر آ رہا تھا جو تیسرے منصوبے کے دوران میں ایک دوست ملک کے اشتراک سے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک لاکھ ساڑھے بہتر ہزار مربع میٹر کے رقبے پر اس کارخانے کی پوری عمارت مشتمل ہوگی۔ اور فیکٹری کا پورا رقبہ ساڑھے گیارہ لاکھ مربع میٹر سے کچھ زیادہ یعنی تقریباً تین سو اٹھارہ ایکڑ ہوگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے ایک ایک فرد کے چہرے پر جگمگاتے مستقبل کی کرنیں ناچتی دیکھے گا ـــــ انھیں بتلائے گا کہ ہمارا گاؤں ہماری قوم خوشحالی بڑھانے کے لیے اپنے ہم وطنوں کے کام آ رہا ہے۔ آندھرا پردیش کی صنعتی ترقی میں یہ پراجکٹ جتنی اہمیت کا حامل رہے گا۔ اتنی ہی اہمیت ”من مول“ کے ان نواسیوں کی رہے گی۔ جنھوں نے اپنا گاؤں رقم اور وطن کے لیے خوشی خوشی دے دیا ہے ـــــ پراجکٹ کی ابتدائی پلاننگ کے نقشوں میں ”من مول“ کا نام دیکھ کر آنے والی نسلیں سوچیں گی کہ یہ چھوٹے چھوٹے گھر جن کے صاف ستھرے آنگنوں میں نیم کے درخت ہوں گے، جن کی چھتوں پر پیپل کے سائے ہوں گے، جن کے رسوئی گھروں سے سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی دھواں اٹھنے لگا ہوگا جن کے ڈھور ڈنگر شام کو ہی لوٹ آتے ہیں۔ جہاں نوجوان رادھائیں دیپ جلا کر کھیتوں سے لوٹتے ہوئے اپنے متوالوں کی منتظر رہتی ہوں گی۔ جہاں بوڑھی مائیں دعائیں دیتی ہوں گی اور شریر بچے اودھم مچاتے

ہوں گے وہ ”من مول“ اب کیوں نہیں ہے۔ اس کے پاس جہاں بھی انھیں زمین مل سکی ہے، منتشر ہو گئے ہیں اور یہ سب کچھ انھوں نے قومی خوشحالی کے لیے کیا ہے۔ یہ بلیدان انھوں نے اپنے وطن کے لیے دیا ہے۔

اپنی تقریر کے لیے ذہن میں مواد جمع کرتا جب وہ سڑک پر پہنچا تو سڑک نے اس کے قدم پکڑ لیے —— مجھے پہچانو ورنہ آگے جانے نہ دوں گی۔ اور جب اس نے سڑک کو پہچان لیا تو اس نے اپنے ساتھی جتندرا سے کہا کہ ”من مول“ میں ایک بار قحط پڑا تھا تو میں اور میرے چھوٹے دادا ایک دوسرے قریہ سے پیلی جوار گدھوں پر لاد کر لے آئے تھے تاکہ گاؤں بھر کی پریشانی عارضی طور پر ہی سہی کوئی دوسرا انتظام ہونے تک دور ہو سکے۔ وہ سماں مجھے یاد ہے۔ راملو جولاہے نے ہمیں گدھوں پر جوار لاتا ہوا سب سے پہلے دیکھ لیا تو وہ بگٹٹ گاؤں میں بھاگا اور لوگوں میں یہ خبر جیسے سوکھی گھاس میں لگی آگ بن گئی۔ بچے بالے دوڑ پڑے۔ جو نقاہت سے چل نہ سکتے تھے وہ بھی اپنے بڑوں کی گود میں سوار جوں توں سڑک تک چلے۔ اکثر بوڑھیاں گھروں سے نکل آئیں۔ جوان عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں کہ ”چھوٹے حضنت“ کے جلو میں آگے بڑھتے ہوئے اس کاروان زندگی کو دیکھیں۔ چنا پنتلو غلہ لا رہا ہے۔ دیکھو وہ دیکھو۔

ہمرا گھرانہ ہدا پنتلو (بڑے استاد) اور چنا پنتلو (چھوٹے استاد) کے نام سے مشہور تھا۔ لوگ اسے چھوٹے حضنت اور بڑے حضنت کا گھرانہ بھی کہتے تھے۔ ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو زندہ سید کی قبر کے نیچے پیپل کی ننگی شاخوں کے اجلے سایوں میں پیلی جوار اس طرح تقسیم ہوئی جیسے سچے موتی صدف سے نکال کر دئے جا رہے ہوں۔ میں ہمیشہ کی طرح زندہ سید کے مزار پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اطمینان سے گھوڑے کی سواری کرنے لگا۔ کتنے ہی بڑے بوڑھے جو مجھے ایسا کرنے پر پھٹکارتے تھے۔ اس سمے چپ ہو رہے۔ جوار لانے میں میں بھی چھوٹے دادا کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے اپنی اس برتری کو محسوس ہی کیا تھا کہ امام چچی نے للکارا

ـــــ اتر مردود کیا ابھی اور قحط پھیلائے گا ـــــ میں زندہ سید کے قبر سے کود پڑا ۔ لیکن میرا جی چاہا امام چاچی کو پیپل کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھا دوں ۔ اور دیکھوں کہ کس طرح اترتی ہیں ۔ یہ میری اپنی دانست میں سب سے کڑی سزا تھی ۔

وہ کہتا گیا ـــــ مجھے سب یاد ہے ۔ کھیل کھیل میں درخت کی کسی اونچی سی شاخ پر جب میں چڑھ جاتا تو مجھے یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اترتے وقت مجھ پر کیا بیتنے والی ہے ۔ جب اترنا چاہتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب پیر پھسلا ۔ اب ہاتھ چھوٹے اب شاخ ٹوٹی اور زمین پر گروں گا ۔ خوف کی بنیادیں اس احساس کے ساتھ ہی اندر ہی اندر گہری ہوتی چلی جاتیں اور میری بے بسی کا عالم دیدنی ہوتا ـــــ اللہ میاں بے طرح یاد آتے اور میں دل ہی دل میں توبہ کرتا کہ کبھی اس قدر بلندی پر نہیں چڑھوں گا ۔ سودا خاں کے باغ سے نہ امرود چراؤں گا اور نہ نارنگیاں ۔ ماں نماز پڑھنا چاہے گی تو وضو کے لیے کنوئیں سے پانی خود نکال کر دوں گا اور اسے ستاؤں گا نہیں ـــــ زندہ سیّد کی قبر پر کبھی نہیں چڑھوں گا ۔

اونچی شاخوں سے آہستہ آہستہ نچلی شاخوں پر آنے میں کامیاب ہو جاتا تو حوصلے بڑھتے اور جب زمین پر پیر ٹک جاتے تو میں خود کو زمانے بھر کا فاتح محسوس کرتا ۔ اس شاخ کو دیکھتا جس پر میں پہنچ گیا تھا تو وہ پہلے پہچانی نہ جاتی اور جو پہچانی جاتی تو ایسی اونچی نہ دکھائی دیتی ۔ اور اللہ میاں کی تو اب ضرورت ہی نہ رہتی اور وہ یاد بھی نہ آتے ۔

جتندرا نے اس کو مخاطب کیا ـــــ گاؤں کے کسی آدمی کو ساتھ لے لو تاکہ وہ ہمیں اور لوگوں سے ملا سکے ۔

اس نے جتندرا کو روک دیا ـــــ ذہن میں چالیس سال پرانا لڑکا بیدار ہو گیا ہے ۔ ہم ذرا اس کی یاد کے سہارے گاؤں بھر چکر لگا آئیں ـــــ ذرا دیکھیں یہ دس سالہ لڑکا ہمیں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے ۔

دیکھو ـــــ اس نے ٹھٹھک کے رکتے ہوئے کہا ـــــ جتندر یہ ہے زندہ سید کا مزار

جس میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ سما گئے ہیں یعنی مرے نہیں ہیں۔ قبر میں زندہ اتر گئے ہیں تاکہ گاؤں والوں کے اعمال کا احتساب کریں اور وقتاً فوقتاً انھیں مصیبتوں سے نجات دلائیں ـــــ یہ جو اتنی بہت ساری قبریں ہیں وہ اس وقت نہیں تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میاں بہت تاخیر سے پہنچا ہوں ـــــ پتہ نہیں کتنے ساتھی زندگی سے منہ موڑ چکے ہیں ـــــ کتنے بزرگ ان سے آگے نکل گئے ـــــ

آؤ اب بائیں جانب گھوم کر سیدھے اس مسجد کے میناروں کی طرف چلتے ہیں۔ میرا گھر وہیں کہیں تھا۔ سنا ہے اب ملبہ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ جس کا ہاتھ لگا اس نے اس سے استفادہ کر لیا۔ کچھ نشانیاں تو رہ گئی ہوں گی۔ نیم کا درخت جس کی شاخ جھکا کر بڑا دادا مسواک کے لیے ڈنٹھل توڑ لیا کرتا تھا یقیناً زندہ ہوگا۔ وہ کنواں تو ہوگا ہی جس کی گہرائی میں ڈول پھینک کر میری ماں ٹھنڈا میٹھا پانی اس تیزی سے نکال لیتی تھی جیسے مرحوم ابا کی یادوں کی گٹھری اس کنوئیں میں گر پڑی ہو اور وہ جلد از جلد اس کنوئیں کو خالی کر دینا چاہتی تھی تاکہ اس گٹھری کو نکال سکے۔ لیکن چھوٹے دادا میری ماں کا ہاتھ تھام کر پانی نکالنے میں ان کی مدد کرتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کنوئیں میں پانی انڈیل کر اس کو لبالب بھر دینا چاہتے ہوں تاکہ میری ماں میرے مرحوم ابا کی یادوں کی گٹھری نکال ہی نہ سکے۔ میں ان باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔

اوہ..یہی میرا گھر ہوگا ـــــ ذرا رک جاؤ ـــــ بالکل یہی ہے ـــــ بے درد دیوار کے اس گھر کو میں پہچان گیا ہوں ـــــ دیکھو نیم کھڑا ہے ـــــ اب وہ اتنا بلند قامت ہوگیا ہے کہ کوئی بھی ہاتھ بڑھا کر اس کی شاخ کو جھکا نہیں سکتا۔ کنواں وہیں ہوگا جو جنگلی خودرد جھاڑیوں میں چھپ گیا ہے۔ یہ گھر تو جوں کا توں میرا سامنے کھڑا ہے ـــــ بالکل اسی طرح جس حالت میں میں نے اس کو چھوڑا تھا ـــــ جیسے درد دیوار سانس لے رہے ہوں ـــــ وہ دیکھو چھوٹے دادا کے

کہنے پر میں شیر کا ناچ ناچ رہا ہوں۔ اور میری ماں دوہری ہو ہو کر ہنس رہی ہے۔

یہ مکان تو بابیا کا ہے ـــ ۔ بیا ولاہا۔ ـــ میرا گُلی ڈنڈے کا ساتھی ـــ اور تم ـــ تم تو بالکل ـــ جی ـــ جی ہیں بابیا کا بیٹا ہوں ـــ اچھا ـــ پھر کہاں ہے وہ ـــ وہ کہاں ہے ـــ مر گیا ـــ

ہوں ـــ آؤ تمہیں سے گلے مل لیں۔

جتندرا نے زبان تک نہیں کھولی ـــ اس نے اجنبی کو اپنے ساتھی کا نام تک نہیں بتایا وہ ان اشاروں کو کنایوں کی آنکھوں کی زبان ہی سمجھتا رہ گیا ـــ ہر بات میں اختصار بھی تفصیل بھی۔

"تو پھر چھوڑ رہے ہو گاؤں۔

" ہاں"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔ کہاں جا رہے ہو

"ابھی کچھ طے نہیں ہے۔"

"عام طور سے لوگ کس طرح سوچ رہے ہیں"

"کچھ خوش نہیں ہیں۔ اپنی زمین چھوٹ رہی ہے۔ گھر بار چھوٹ رہا ہے۔ وہ کہنے لگا۔ ہمیں اپنے مستقبل کے لیے کچھ تو تجنا ہی ہو گا میں بھی یہی باتیں تو تم لوگوں سے کرنے آیا ہوں۔

چلو آگے چلتے ہیں۔ اس نے جتندرا کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

آؤ اس پیپل کے سائے میں پہنچ کر اس کے سائے کو محسوس کریں۔ یہ پیپل بڑا پرانا ہے۔ کتنی ہی کہانیاں اس کے گھنے سایوں میں بنی ہیں؟ ہم تلنگی پڑھنے کے لیے جب اس مندر کی طرف جاتے تھے۔ اس ٹھنڈے گھنے سائے میں ذرا رک کر دم لینا ضروری تھا۔ پیسے اور کانسے کی گولیاں صرف لمحے بھر کے لیے جیبوں سے نکالی جاتیں۔ پھر لمحہ پھیلتا جاتا۔ کئی

کئی منٹ گذر جاتے تھے۔ شاید کسی ہم جماعت نے چنچے پنتلو کو مندر کے چبوترے پر چڑھا کر بتلایا کہ ہم کھیل رہے ہیں —— پنتلو نے وہیں سے پکارا ——

پیٹھ کھُجا رہی ہے کہ سَر کھُجا رہا ہے۔

ہم اپنی اپنی گولیاں بٹور کر جیبوں سے محفوظ کر لیتے اور بگٹٹ دوڑ کر پنتلو کے آگے پہنچ جاتے —— درخت کے سائے سے مندر کے سایوں میں پہنچنے تک یہ بات قطعی ہوگئی ہوتی کہ سبق ختم ہونے پر اس لڑکے کی درگت بنائی جائے گی۔ جس نے ہمیں کھیلتا ہوا پکڑوا دیا ہے۔

ایک بار لگان ادا نہ کرنے کے جرم میں پٹیل پٹواریوں نے بہت سارے کسانوں کو پکڑ لیا تھا اور یہاں چاوڑی پر لے آئے تھے جھلستی ہوئی گرمیاں تھیں۔ لو دیتا ہوا دن تپتے ہوئے بڑے بڑے پتھر ان کے سروں پر لاد دئے گئے تھے۔ ہم دو تین ساتھی یہ ساری کاروائی اسی پیپل کی گھنی شاخوں میں چھپ کر جھانک رہے تھے۔ اس کے بعد موٹی موٹی تنی ہوئی مونچھوں والے پٹیل سے ہمیں نفرت سی ہوگئی تھی اور ہم دل ہی دل میں اس سے ڈرنے لگے تھے۔

آؤ داہنی اور گھوم کر اس گلی سے چلیں تو شاید ہم مسجد کے پچھواڑے نکلتے ہیں۔

ٹھیک ہے ہر چیز جوں کی توں ہے۔ گاؤں والے بدل گئے ہیں میں بدل گیا ہوں۔

لیکن گاؤں بالکل نہیں بدلا —— پیپل کے سائے سے جو مندر نظر نہیں آ رہا تھا اس کا دروازہ یہ رہا —— اور پھر اسی میدان کا چکر کاٹ کر بائیں جانب مڑ جاؤ تو مسجد میں داخل ہو سکتے ہو —— مندر میں ہم ’سُرسوتی اوم ناتھ‘ پڑھتے‘ اور مسجد میں گلستاں اور بوستاں۔ چنچا پنتلو تلگو پڑھاتا تھا اور میرے دادا گلستاں بوستاں پڑھاتے تھے۔ گاؤں کا کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو ان دونوں کا شاگرد نہ ہوا اور جس کی ان دونوں کے ہاتھوں پٹائی نہیں ہوئی ہو۔

وہ اونچی لال چھت دیکھ رہے ہو۔ وہ یقیناً رحمن ریڈی کا بنگلہ ہوگا۔ یہ بنگلہ ان

دنوں نہیں تھا۔ اور اگر تھا بھی تو ایسا نہ تھا جو آج دکھائی دے رہا ہے۔ رحمن ریڈی میرا ساتھی ہے۔ سنا ہے میرے ساتھیوں میں صرف وہی ایک زندہ ہے۔ چھمبو کمہار اور لچھو دھوبی اور بابیا جولاہا یہ سب کے سب چل بسے ہیں۔ ان کی آل اولاد یقیناً ہوگی۔ جو مجھے جانتی نہیں۔

وہ گاؤں بھر میں گھومتا رہا۔ ایک ایک چیز کو دیکھتا۔ یادوں کو سمیٹتا ایک ایک چیز کو تکتا مسجد کے پیچھے شنجو بی بی کا مکان تھا جو پیش امام کی بیوی تھیں پیش امام کو مرے زمانہ ہو گیا تھا۔ بوڑھیا بھی اب کہاں باقی ہوگی۔ اس کے قدم پھر بھی دروازے کی طرف اٹھ گئے اور اس نے کنڈی کھٹکھٹا دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے زور زور سے پھر کھٹکھٹایا

“کون ہے رے ” آواز بوڑھی تھی ”

“میں ہوں ماں ”

“میں کون ” بوڑھی نے دروازہ کھولا تو وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔

اچھا تو ہے —— تو بڑے حشمت کا پوتا ہے نا —— مجھے بڑا انتظار تھا تیرا ”

“ہاں ماں میں آگیا ہوں ”

کیوں آیا ہے ابھی دن اور نہ آتا۔ اور پھر کیا لے آیا ہے رے ہمارے لیے یہی خوش خبری نا کہ گاؤں چھوڑ دو —— اس لیے چھوڑ دو کہ تیرا ملک ترقی کر رہا ہے۔ یہ تیرا ملک ہمارے ہی گاؤں میں کیوں ترقی کر رہا ہے۔ ہم اپنا گھر بار چھوڑ دیں —— کھیت کھلیان چھوڑ دیں۔ مسجد کے کنوئیں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی چھوڑ دیں۔ جو ہر ایک کی رگوں میں خون بن گیا ہے۔ یہاں کے سائے چھوڑ دیں —— یہاں کی دھوپ چھوڑ دیں۔ اس مندر کو چھوڑ دیں جہاں تو نے “آمد نامہ” پڑھا تھا۔ اس مسجد کو چھوڑ دیں جہاں تجھے تیرے دادا نے گلستاں بوستاں پڑھائی اور تب کہیں جا کر تو نے شہر میں بڑی ڈگریاں لیں۔ تو تو بھول بیٹھا ہے۔ تجھے تو یہ بھی یاد نہ ہوگا کہ جب تو چھوٹا سا تھا تو ہیضے کی دبا میں

اللہ میاں کو پیارا ہوگیا ہوتا اگر میرا مولوی تجھے نہ بچاتا۔ کیسا بے کل تھا وہ رات بھر پلک نہ جھپکی اس کی دن بھر زمین سے پیٹھ نہ لگی۔ منٹ منٹ پر دم کر کر کے تجھے پانی پلاتا تب کہیں تو نے آنکھیں کھولیں۔ جب کچھ ہاتھ پاؤں نکالے تو شہر کا ہو رہا۔ پلٹ کر سدھ بدھ تک نہ لی اور آج چالیس سال بعد یہ کہنے آیا ہے کہ میری ہڈیاں اب میرے مولوی کے برابر دفن بھی نہ ہوں گی ـــ ارے میں نے تو اپنی قبر تک کھدوالی ہے۔ اپنے نام کا کتبہ تک لگوالیا ہے۔ صرف میری موت کی تاریخ کھودنی باقی رہ گئی ہے۔ سو یہ کام تو کر دینا۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے تو ـــ"

وہ کہتی گئی ـــ میں نے اپنے ایک ایک بچے سے کہہ دیا ہے کہ گاؤں خالی نہیں ہوگا۔ سرکار بنوالے اپنی فیکٹری ہماری لاشوں پر۔ جب تک ہماری آنکھوں میں بینائی ہے میرے گاؤں کا کوئی بچہ من مول کی ایک کٹیا کو بھی زمین پر آتے ہوئے نہیں دیکھے گا۔ گھر تو گھر ہیں تجھے پتہ ہے جب کوئی گھر ڈھے جاتا ہے تو آدمی اس کا ملبہ عمر بھر اپنے سینے میں اٹھائے پھرتا ہے۔ لیکن گھر نہیں بنتا۔

سنتی ہوں تیری سرکار معاوضہ دے گی۔ بھلا بتا تو ان ہواؤں کا معاوضہ کیا ہوگا جو نتھنوں سے جسم میں اتر کر روح بن گئی ہیں۔ تو نے گاؤں کی ہر ریت بھلادی ہے۔

تجھے تو اب تک یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ چالیس سال کے بعد تو نے اپنے گاؤں کی دھرتی پر قدم رکھا ہے۔ لیکن تیرا کوئی ساتھی تیرا کوئی دوست تیرے سواگت کو گاؤں کی حد تک بھی نہ آیا ویسے تیرے آنے کی خبر سب کو ہے ـــ یہ کوئی اچھی علامت ہے رے۔ اور تو دیوانوں کی طرح گاؤں میں اکیلا پھر رہا ہے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے تیرے آنے کی میرے بچوں کے دلوں میں خوشی بھی نہیں ـــ آخر کیوں ـــ بچھڑا بھائی اپنے گھر آیا ہے۔ تو کوئی بڑھ کر گلے لگانے والا تک نہیں۔ یہ "من مول" یہ گاؤں یہ تو ایک خاندان ہے۔ یہ تو ایک گھرانہ ہے اور تو بھی اسی خاندان اسی گھرانے

کا بیٹا ہے۔“

اور تم اس گھرانے کی ماں ہو—— اس خاندان کی ماں ہو—— سارے من مول کی ماں ہو—— ہونا“ ۔

”ہاں ہوں—— بالکل ہوں۔“

”کیوں نہیں ہوں—— کیوں نہیں ہوں—— مگر تو“

”مگر تم نے میری بات سنی ہی کہاں۔“

میں تو اپنی ماں کے لیے اس کی ماں کا پیام لے کر آیا تھا۔ میں تو اپنے من مول کے لیے ہندوستان بھر کی دھرتی کا سلام لایا تھا۔“

میں تو یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ کوئی سرکار ہم سے ہمارا من مول نے نہیں رہی ہے ماں۔ لیکن ہم خود اپنے وطن کو اپنا من مول دے رہے ہیں۔ ہم اپنے مستقبل کو اپنا حال دے رہے ہیں۔ اپنے کل کو آج دے رہے ہیں۔ تم مان جاؤ ماں—— تم مان جاؤگی تو سارا اگاؤں مان جائے گا۔ آنے والی نسلیں ہمیں یاد رکھیں گی ماں۔ جب الیکٹریکلس پلانٹ مکمل ہو جائے گا ماں تو خوش حالی بڑھے گی۔ تیرے ہی بچے بالے سکھ اور آنند کی زندگی گذاریں گے۔ کتنے ہی لوگوں کو کام مل رہا ہے۔ تو ذرا سوچ تو ماں۔ غفورے نے ابھی بتایا تھا کہ وہ اور اس کے دونوں بھائی پلانٹ ایریا کے اطراف میں بنتے ہوئے بارکیس اور عمارتوں میں مستری کا کام کر رہے ہیں۔ اور انھیں یومیہ ساڑھے دس روپے مل رہے ہیں۔ اس طرح تیرے گھر میں یومیہ اکیس روپے آجاتے ہیں اور تو پھر بھی خوش نہیں ہے۔

بہت خوش ہوں بہت خوش ہوں—— یہ چار دن کے اکیس روپلی نے تجھے خبر ہے مجھ سے کیا کیا چھین لیا ہے۔ ان روپوں نے کھلیانوں کا سونا چھین لیا۔ ان روپیوں نے میرے بچوں کا وہ پسینہ چھین لیا جن کی کھار پی کر سوندھی جوار کے خوشے لہلہاتے

تھے ۔ ان روپیوں نے بیلوں کی گھنٹیوں کی وہ میٹھی آوازیں چھین لی ہیں جنھیں سن کر تو بیدار ہوتا تھا ۔ اور آج ان آوازوں کے سُر مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے نیچے دب گئے ہیں ۔ اور ایسے میں تو مجھے عقل سکھانے آیا ہے ۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھ کر مجھے بتانے آیا ہے کہ سفید بال دھوپ میں پکے ہیں ۔ میں کہوں ۔ میں کہوں — کوئی کتاب سفید بال سے زیادہ نہیں ہوتی ۔

اس نے بہ غور جتندر کو دیکھا — پھر کچھ اس طرح کہنے لگا جیسے خود اپنی کھوئی ہوئی آواز کو ڈھونڈ رہا ہو ۔

"ماں کیا! تجھے وہ دن یاد نہیں ہے جب سرکار نے مجھے جیل میں بند کیا تھا ۔ وہ ہماری سرکار نہیں تھی اور تو نے فخر سے کہا تھا کہ اپنے وطن کے لیے لڑنے والا دنیا تو ہمارے گاؤں کا بیٹا ہے ۔ کل تو جب اپنے بیٹے کو جیل میں دیکھ کر فخر کر سکتی تھی ماں تو آج اپنا گھر اپنے دیش کے لیے چھوڑتے ہوئے بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے ۔

یہ گاؤں مجھے بھی اتنا ہی پیارا ہے ماں — مجھے بھی یہاں کی ایک ایک چیز سے محبت ہے ۔ ایک ایک چہرہ میری یادوں میں بسا ہوا ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے اپنے من مول کی دھرتی پیاری نہیں ہے ۔ میرے گھر کے کھنڈر بھی یہیں ہیں — میرے باپ دادا بھی یہیں دفن ہیں ۔ لیکن ہم جس کے لیے یہ سب چھوڑ رہے ہیں وہ دیش بھی ہمارا ہے ۔

اپنے گھر میں اپنا کمرہ سب کو پیارا ہے اپنے گاؤں میں اپنا گھر سب کو پیارا ہوتا ہے اپنے شہر میں اپنا گاؤں سب کو پیارا ہوتا ہے ۔ اپنے صوبے میں اپنا شہر سب کو پیارا ہوتا ہے محبت اور پیار کا یہ تصور اس طرح وسیع تر ہوتا جاتا ہے ماں ۔ اور جب سارا دیش کسی کو پیارا ہو جاتا ہے تو ساری تفریق مٹ جاتی ہے ۔ جب سارے دیش کی دھوپ چھاؤں اپنی ہو جائے تو من مول بہت وسیع ہو جاتا ہے ۔ اس کا پیار بہت وسیع ہو جاتا ہے ۔ اس کی حدیں دیش بھر میں پھیل جاتی ہیں ۔"

بوڑھی ماں نے نظریں اٹھا کر دور دور تک دیکھا جیسے من مول کے حدود سے دیش بھر کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دوہری ہو کر اپنی چٹائی سے اٹھی۔ اس نے کہا مجھے نقارے کے میدان تک لے چل بیٹا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے نقارہ پیٹ کر منادی کر دوں گی۔

نقارے پر ہلکی سی چوٹ پڑی۔ پھر آہستہ آہستہ نقارے کی آوازیں فضاؤں میں بلند ہو کر پراجکٹ مشینوں کی آوازوں سے بغل گیر ہو گئیں۔ اور "من مول" اڑ کر رام چندرا پورم کی طرف بڑھنے لگا۔

جوگندر پال

مقامات

سوتے سوتے اگر آدمی مرا نہ ہو تو پَو پھٹنے سے پہلے یا بعد جاگ ہی پڑتا ہے بہت دیر سے سہی جمال نے بھی آنکھ کھول لی ہے۔ اس کا خواب ٹوٹ گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی آنکھوں میں دھبے ناچ رہے ہیں۔

امی —— امی —— ی —— وہ ننھا منا سا ہے اور کھویا ہوا ہے اور رو رو کر اس کی ہچکی بندھی ہوئی ہے اور اپنی ناک کی سیدھ میں چھوٹے سے چھوٹے قدموں سے چلتے ہوئے وہ اور کھوتا جا رہا ہے۔ کسی نے بھی اسے روک کر نہیں پوچھا ہے ادھر کہاں جا رہے ہو بالک —— مگر وہ بلک بلک کر جواب دے رہا ہے امی —— امی کے پاس —— اور پھر ایک دم دو باہوں نے کہیں سے کوند کر اسے لپک لیا ہے اور اپنی امی کو دیکھے بغیر اسے پتہ چل گیا ہے کہ وہ امی ہے اور —— اور امی کی پیشانی پر سے راستہ سیدھا ان کے گھر کو ہی جاتا ہے —— آہ۔

جمال کے سپنے کے بکھرتے ہوئے گملے پھر ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئے ہیں اور اس کی آنکھیں مندنے لگی ہیں ——

پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم —— بسم اللہ ——

بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم

الرحمٰن

الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولوی صاحب لوگوں کے دس دس ہوتے ہیں پر میرا ایک ہی دس سے کم نہیں میرے جمال کو جلدی قرآن حفظ کروا دیجئے پورے دس کا ندرانہ پیش کروں گی۔

پڑھو۔

پڑھ تو رہا ہوں مولوی صاحب

نہیں دل سے پڑھو خدا کے نام کو دل سے پڑھوگے تو تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی۔

جمال نے آنکھیں کھول لی ہیں اور کھلی آنکھوں سے بھی اسے کچھ دکھائی نہیں دیا ہے تو اسے یقین آگیا ہے کہ وہ ابھی سویا ہوا ہے۔

ابھی ابھی تو امی ہمارے ساتھ تھی کہاں گئی —— امی —— ی —— جاؤ خورشید دیکھو امی کہاں رہ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں موتیا اترا ہوا ہے۔ جاؤ ہاتھ پکڑ کرلے آؤ

—— امی —— ی ——

" امی آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو آپ کو کوئی اور نظر ہی نہیں آتا "۔

جاؤ خورشید امی بیچاری کہیں ٹھوکر کھا کر گر جائے گی۔

مجھ بیچاری کی طرف بھی آپ کیوں نہیں دیکھتے۔ جب سے شادی ہوئی ہے ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ جاؤ خورشید

جاؤ خورشید

آپ کی بیوی بننے سے تو یہی اچھا تھا کہ میں بھی آپ کی ماں ہی ہوتی۔

اچھا تم یہیں ٹھہرو میں خود ——

نہیں میں گھر جا رہی ہوں۔

خورشید ——

نہیں ——

نہیں —— نہیں —— نہیں —— نصف شب کو ایک پاگل بڑھیا جمال کے سونے کے کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہی ہے۔ میں پاگل نہیں ہوں جمال — جمال — ل

—— سو جاؤ امی ——

نہیں بیٹے دروازہ کھولو اور میرے پاس آکر بیٹھو بیٹے۔

کھٹ کھٹ —— ٹھ ——

جمال نے بڑی بے بس نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا ہے۔

سونے کی ایک اور گولی دے آؤں خورشید ——

مارنا چاہتے ہیں تو دے آیئے پہلی گولیاں دیے ابھی پورا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔

کھٹ —— ٹھ ٹھ —— کھٹ —— ٹ ——

سو جاؤ امی کل سویرے آفاق کا امتحان ہے۔ خدا کے لیے سو جاؤ۔

چپ چاپ لیٹے رہیے۔ زیادہ توجہ دیں گے تو امی کا پاگل پن بڑھے گا۔

نہیں میں پاگل نہیں ہوں۔ بہو۔ دروازہ کھولو —— مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لو بیٹے میں کچھ نہیں بولوں گی چپ چاپ بیٹھی رہوں گی —— کھولو —— کھٹ —— ٹھ ——

اُفوہ خدارا اپنی پاگل ماں کو پاگل خانے بھیج دیجیے! ہم سب کو —— وہ دیکھیے آفاق بھی جاگ پڑا ہے۔ ابھی ابھی سویا تھا۔

جمال —— جما —— کھٹ کھٹ —— ٹھ ——

جمال نے دیوانہ وار اُٹھ کے دروازہ کھولا ہے اور ماں کو تیزی سے کھینچ کر چارپائی

پر بیٹخ دیا ہے۔ وہ چیخنے لگی ہے اور ـــــ اور جمال کے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے گلے کی طرف بڑھتے ہوئے اکڑنے لگے ہیں۔ اکڑا اکڑا کر آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں ـــــ اور پھر اچانک سنبھل کر وہ رک گیا ہے ـــــ نہیں۔

ـــــ نہیں نہیں جمال اپنی مرحوم ماں کے خالی بیڈروم میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں میں اپنی ماں کی صرف ناک یا صرف سر یا ماتھا یا کوئی اور حصہ گھوم رہا ہے اب اس کی صرف آنکھیں جھپک رہی ہیں اب ہونٹ ہل رہے ہیں۔ اب ٹھوڑی ـــــ جمال اس کے ان سارے انگوں کو جوڑ کر اس کی پوری شبیہہ بنانا چاہتا ہے ـــــ یہ ماتھا اور یہ آنکھیں اور لیکن ماتھا آنکھوں کی جگہ آتا ہے ـــــ نہیں ـــــ اب وہ کبھی اپنی ماں کی صورت کو نہیں دیکھ پائے گا اپنی ماں کی صورت اس کے دل و دماغ میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ نہیں ـــــ

جمال کے خوابیدہ چہرے پر جنبش سی ہوئی ہے جیسے کوئی مردہ مچھلی نیچے سے اوپر آ رہی ہو اور تالاب کی ساکن سطح پر ہلکا سا ارتعاش ہوا ہو۔

وہ تو پاگل تھی خورشید اسے کیا معلوم کہ وہ کیا کر رہی تھی؟ ـــــ اس کی کل کائنات ایک مَیں ہی مَیں تھا اور جب مَیں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تو باؤلی اور باؤلی کیوں نہ ہو جاتی؟

ـــــ تمھیں معلوم ہے خورشید اوپر اوپر سے تو مَیں اس کا علاج کروا رہا تھا لیکن اندر ہی اندر اس کی موت کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر نے اس کی تکلیف دیکھ کر جب مجھ سے کہا خدا سے دعا کرو کہ تمھاری ماں کو اُٹھا لے تو مَیں بہت خوش ہوا ـــــ نہیں یہ غلط ہے کہ مَیں اس کی اذیّت سے پریشان تھا مجھے دراصل اپنی اذیّت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی پڑی ہوئی تھی ـــــ مَیں ـــــ میں اپنی ماں کے قتل کا مرتکب ہوا ہوں خورشید ـــــ ہاں مَیں ہی اسے موت کی طرف ڈھکیلتا رہا ہوں لیکن پاگل ہو کر بھی ماں کو کبھی اپنے بیٹے پر شبہہ نہیں گزرا اور خورشید مرنے سے چند گھڑیاں پہلے ـــــ تم نے دیکھا ـــــ وہ ایسی ہو گئی

جیسے کبھی پاگل تھی ہی نہیں — میں نہ کہتا تھا پگلی کو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ چُپ چاپ چُپ چاپ ہم سب سے باری باری پیار کیا۔ میں سب سے آگے تھا لیکن مجھ سے وہ سب کے بعد ملی جو ہمیں سب سے عزیز ہوتا ہے ہم سب سے عزیز ہوتا ہے خورشید اس سے بچھڑنا ہم پل پل ٹالتے جاتے ہیں — ہے نا — وہ مجھے کس کر بھینچ لینا چاہتی تھی لیکن ہڈیوں کے گچھے میں اپنی باہیں اُٹھانے کا بھی دَم نہ رہا تھا۔ میں اس کی گود میں سَر رکھ کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا اور اسے بازوؤں میں جکڑ کر روک لینا چاہا لیکن — لیکن

بادل کے ٹکڑے آسمان میں یکجا ہو ہو کر نیچے اُترنے لگے ہیں اور اُتر اُتر کر انھوں نے زمین کو چھولیا ہے اور بہنے کے انداز میں اڑنے لگے ہیں۔ اور جمال ان میں غوطے کھائے جانے کے باوجود ڈوب نہیں رہا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ بہتا جا رہا ہے اور ایک پُل کے نیچے سے بہ گیا ہے تو پھر وہی پُل آگیا ہے اور پھر بہ گیا ہے تو پھر وہی پُل — پھر وہی — پھر — اور اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد کرنا چاہا ہے — شاید وہ جاگ پڑا ہے؟ نہیں — ابھی نہیں —

ایک بات سنو خورشید سنوگی تو ہنس دوگی — امی کو مَرے کتنے سال ہو گئے ہیں؟

— پانچ — نہیں چھ مگر مجھے خیال آرہا ہے کہ امی مَری نہیں ہمیں یوں ہی وہم ہو گیا ہے کہ وہ مر چکی ہیں — ذرا سوچو ماں مر جائے ہماری زمین ہی مر جائے تو ہم کیونکر اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکتے ہیں — نہیں خورشید ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے کونسی ماں چاہے گی کہ اس کے لہلہاتے ہوئے معصوم پودے ایک دَم کھڑے کھڑے سوکھ جائیں۔ قدرت معصوموں کے ساتھ بے انصافی نہیں برتی۔ ماں ہمیشہ زندہ رہتی ہے ہمیشہ۔

اسی اثنا میں اچانک جمال کا چھوٹا بچہ رفو ساتھ کے کمرے میں رونے لگا ہے اور بچے کی ماں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف بھاگی ہے — اور — اور جمال کو لگ

رہا ہے کہ یوں ہی والہانہ بھاگتی جا رہی ہے لیکن وہیں کی وہیں ہے —— ٹھہرو آفاق میں آ رہی ہوں —— رفو گھبراؤ نہیں آفاق کو دیکھ کر ابھی آتی ہوں —— اسی طرح بھاگتے ہوئے اسے کئی سال بیت گئے ہیں اس ایک لمحے میں کئی سال بیت گئے ہیں اور پھر اس نے یکبارگی رُک کر پیچھے مُڑ کے دیکھا ہے —— وہی —— وہی باولا سا چہرہ دودھیلی ممتا میں چھپی چھپی جھریاں تشویش —— امی —— ی — اتنی رات ہو گئی ہے آج پھر آفاق نہیں آیا —— آفاق کے ابا اس کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا ہے اور دیکھتے دیکھتے چھوٹا سا نکل آیا ہے —— یہ تو —— یہ تو —— نہیں خورشید ماں ہمیشہ ہی زندہ رہتی ہے —— جائیے پتہ کیجیے آفاق ابھی تک کیوں نہیں آیا —— آفاق —— آفاق —— کیا صرف آفاق کے لیے چاند کا ٹکڑا دیکھ کے آئی ہوں —— آفاق —— آفاق بیٹا ذرا ٹھہرو تم تو میرے پاس ایک منٹ بھی نہیں بیٹھتے بیٹا میں تمھارے لیے دلہن دیکھ کے آئی ہوں —— نہیں ماں شادی میری ہے آپ لوگوں کی نہیں —— دراصل —— میری شادی ہو چکی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے چاہا تو میں اسے یہاں لے آؤں گا نہیں تو ہم دونوں الگ رہیں گے —— الگ رہیں گے —— آفاق کے ابا چپ کیوں ہو۔ سُن رہے ہو ہمارا بیٹا ہم سے الگ رہے گا —— مجھے چکّر آ رہا ہے آفاق کے ابا —— مجھے تھام لو —— اچھی طرح تھام لو —— نہیں تو مَیں دھڑام سے گر جاؤں گی —— آ بہو —— آؤ بیٹی —— تم تو میرے لاڈلے کی دلہن ہو۔ مَیں تم دونوں سے الگ کیسے رہ سکتی ہوں —— آؤ۔

پھر وہی پَل آ گیا ہے اور جمال غوطے کھا کھا کے بے اختیار اس کے نیچے سے بہ گیا ہے اور پھر اس نے بمشکل سر اُٹھا کے اپنے آگے دیکھا ہے کہ تا حدِ نظر وہی پَل۔ اک کے بعد ایک کھڑا ہے اور وہ بہ یک وقت ہر پَل کے نیچے سے لڑھکنے کے انداز میں بہ رہا ہے۔

دیکھیے امّی آپ اپنے بیٹے کی طرف کم توجہ برتا کیجیے۔

یہ کیا کہہ رہی ہو بہو۔ مَیں نے تو اندھی باؤلی ہو ہو کر اپنے آفاق کو اونچا کیا ہے۔

لیکن اب میں اونچا ہوگیا ہوں نا امی۔

لیکن مجھے تو اب بھی ویسے ہی لگتے ہو بیٹے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ —— نہیں امّی مَیں اب دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ آپ کے اس قدر پیار اور توجہ سے مجھے پریشانی ہوتی ہے۔

بادل دھرتی کو سوکھا چھوڑ کے آسمان کی طرف اُٹھنے لگے ہیں —— برس جاؤ خدا کے لیے برس جاؤ۔

آفاق کے ابا —— آفاق کے ——

ہاں بھئی کہو۔ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔

بہو نے میکے سے کہلوا بھیجا ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ نہیں رہے گی۔ جب تک آفاق الگ رہائش کا بندوبست نہیں کر لیتا وہ اپنے میکے سے نہیں آئے گی —— اب کیا ہوگا آفاق کے ابا —— یہ کیا ہو رہا ہے خدایا —— میرا خون پانی ہو رہا ہے لیکن تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو آفاق کے ابا ——

وہ آفاق جا رہا ہے —— آفاق —— آفاق —— ادھر آؤ بیٹا —— یہاں بیٹھو —— نہیں بیٹا جلدی ہیں۔ بھی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ میں تمھارا زیادہ وقت نہیں لوں گا —— کیا یہ سچ ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔

اس میں حرج ہی کیا ہے ابّا آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں اپنی زندگی جینا ہے۔

ہمیں کون —— بیٹا؟ —— تم اور تمہاری بیوی —— ہے نا؟ مگر بیٹا تمھاری ماں کی اور ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ ہمیں بھی اپنوں میں شامل کئے رکھو ذرا آرام سے میری بات سُنو —— ہماری ساری کی ساری محبت صرف ایک شخص کے لیے ہی ہو تو۔ دراصل ہماری اس محبت میں وہ ساری محبتیں کام کر رہی ہوتی ہیں جو ہمیں اوروں سے بھی ہوں —— ہاں بیٹا ماں یا بہن سے پیار کئے بغیر کوئی اپنی محبوبہ سے پیار نہیں کر سکتا —— ہاں بیٹا جو

سب سے پیار کرتا ہے وہی صرف ایک سے پیار کر سکتا ہے۔

تمھیں معلوم نہیں بیٹا کہ کوئی پائدار رشتہ الگ سے وجود میں نہیں آتا بلکہ سب رشتوں کا —— ساری زندگی سے ہمارے رشتوں کا ایک آپسی تال میل ہوتا ہے نہ ہو تو کوئی محبوب ترین رشتہ بھی نہ ہو —— اب جاؤ خدا تمھاری مدد کرے ——

باہر سے کھکھٹاہٹ سی محسوس کر کے جمال کے ماتھے کے نیچے دونوں کواڑ ذرا سے ہلے ہیں اور کوئی آواز کئے بغیر چوپٹ کھل گئے ہیں اور وہ ابھی کواڑوں کے اندر باہر ہی ہے کہ اسے پیر سال ممتا کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی ہے —— آفاق کے ابا —— آفاق کے —— وہی —— اس نے بڑی گہری تھمی ہوئی نظر سے بے تاب آواز کی پرچھائیں کو دیکھا ہے اور پھر بے اختیار آگے بڑھ کر اسے بھینچ لیا ہے۔ میں تمھیں کبھی نہیں چھوڑوں گا ماں —— کچھ بھی ہو جائے۔

قرۃ العین حیدر

پالی ہل کی ایک رات

(ایک تمثیل جس کے سارے کردار قطعی فرضی ہیں)

۱۔ ہومائے اردشیر جنگ والا۔

۲۔ رودابہ جنگ والا

۳۔ آنٹ فیروزہ

۴۔ آغائے داراب کاظم زادہ

۵۔ خانم گلچہر اسفندیاری

مقام: پالی ہل، بمبئی —— زمانہ: جولائی ۱۹۷۶ء وقت آٹھ بجے شب

وسیع اسٹیج ۔ عقبی دیوار کے وسط میں کھلا دریچہ۔ اس کے دونوں طرف گوا کی سیاہ تپائیوں پر منگ گلدان، بائیں دیوار پر دو روغنی اکیڈمی پورٹریٹ۔ ان کے عین نیچے کوئن این صوفہ۔ دو کرسیاں۔ ایک کارڈ ٹیبل۔ کونے میں کاٹج پیانو۔ اس کے اوپر روپہلی فریم میں ایک متبسم خوبرو نوجوان کا بہت بڑا فوٹوگراف۔ بلوری مرتبان میں ایک جنک (چینی جہاز) کا ماڈل۔ ایک یونانی گلدان۔ دیواروں پر ولایتی وال پیپر جو جگہ جگہ سے اکھڑ چکا ہے۔ اسٹیج کے دائیں حصے میں گول ڈائننگ ٹیبل۔ اور دو کرسیاں۔ وکٹورین سائڈ بورڈ۔ اس پر ایک شمعدان WILLOW PATTERN کی نیلی برطانوی پلیٹیں۔ اور ملکہ الزبتھ، پرنس فلپ،

شہنشاہِ ایران اور شہبانو فرح پہلوی کی تصاویر۔ دو ٹوبی مگ (TOBY MUGS)۔ میز پر تین افراد کے لیے پلیٹیں، چھری کانٹے اور گلاس مع نیپکن۔ فٹ لائٹس کے قریب اسٹیج کے بائیں کنارے چوبی منقش چینی صندوق پر ایک سیاہ ایرانی بلی نخوت سے متمکن ہے۔ کمرے کا سارا ساز و سامان خستہ اور بوسیدہ۔ دائیں اور بائیں پہلو کی دیواروں میں دروازے۔ دریچے کے اوپر کگّو کلاک جو آٹھ بجا رہا ہے۔ سیاہ ریشمی کیمونو پہنے، جس پر رنگ برنگے دھاگے سے ایک مہیب ڈریگن کڑھا ہے، ناظرین کی طرف سے پُشت کیے ہوما ئے جنگ والا دریچے میں کھڑی ہے۔ روداب جنگ والا انگریزی ڈریس میں ملبوس پیانو کے سامنے بیٹھی LET's ALL GO DOWN THE STRAND بجا رہی ہے۔ پھر وہ اچانک ON RICHMOND HILL THERE LIVES A LASS شروع کر دیتی ہے۔

ہوما ئے:۔ اوہ، شٹ اپ۔ روڈی —— میں دعا میں مصروف ہوں۔ ڈسٹرب مت کرو۔

روداب TIS THE LAST ROSE OF SUMMER LEFT BLOOMING ALONE بجانے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

ہوما ئے:۔ روڈی —— آج پورنماشی کی رات ہے اور میں آج ہی وضو کرنے میں گڑبڑا گئی —— بتاؤ —— منھ دھونے سے پہلے اَشیم وہو پڑھتے ہیں نا —— پھر کلّی کرنا —— پھر تین دفعہ نیچے دھونا —— پھر تین دفعہ کہنیوں تک ہاتھ —— ہاتھ کی طرف سے کہنیوں تک نا ——؟ پھر پاؤں —— ذراسی بھول چوک میں گناہ ہوگا —— روداب منہ اٹھا کر "لاسٹ روز آف سمر" گانا شروع کر دیتی ہے۔ دونوں عورتوں کے چہرے اب تک چھپے ہوئے ہیں۔ اب ہوما ئے پہلی بار حاضرین کی طرف رُخ کرتی ہے۔ ایک معمر، پریشان صورت عورت۔) روڈی —— بتاؤ —— اسکول کی چھوکریوں کی طرف شور مت کرو —— کل میں نے پنج گاہ کی نمازیں قضا کر دیں۔ قضا پڑھنا فرض ہے نا —— ؟ کل دستور جمشید جی سے پوچھوں گی۔ آج پورنماشی ہے۔ میں ماہ بنائیش کی تلاوت کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن بادلوں میں چاند نظر ہی نہیں آ رہا —— بڑے زور کی بارش آنے والی ہے۔ ہوشنگ کیسے پہنچے گا ——

(روداب سُنی اَن سُنی کر کے پیانو بجاتی رہتی ہے۔ باہر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ اوپر چھت پر سے کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ باہر بلّیاں رو رہی ہیں۔ چینی صندوق پر بیٹھی ایرانی بلی

کا ہلی سے اتر کر صوفے کے نیچے چلی جاتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ ہومائے اُونچی آواز میں خدا کے ایک سَو ناموں کا وِرد شروع کردیتی ہے۔

ھومائے :۔ یزد — ہروسپ توان[1] — ہروسپ[2] آگاہ — ہروسپ[3] خداادری انجام۔ افزا۔ پرورا۔ خروشیدتم۔ ہرمید۔ ہرنیک فرہ — فرمان کام۔ افرموشں۔ اترس۔ افرازدم۔ آدر بادگر۔

رودابہ :۔ (زور سے گاتی ہے)۔

WEEP NO MORE MY LADY
O WEEP NO MORE TODAY
WE SHALL SING ONE SONG OF THE OLD KENTUCKY HOME OF THE
OLD KENTUCKY
FAR AWAY

ھومائے :۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) — آدرنمگر۔ بادنمگر۔ بادگل گر۔ اگمان۔ ازمان۔ فیروزگر۔ نیافرید۔ دادار۔ خرومند۔ داور۔

(باہر دریچے کے نیچے قدموں کی چاپ)

رودابہ :۔ (رک کر)۔ کوئی آیا۔

(دائیں دروازے کی کال بیل بجتی ہے)

ھومائے :۔ (کواڑ ذرا سا کھول کر باہر جھانکتی ہے رودابہ سے کہتی ہے۔) ینگ فارنرز۔!

رودابہ :۔ ہپّی —؟

ھومائے :۔ نہیں — ہپّی نہیں۔ نہایت شاندار انگریز —— (دروازہ کھولتی ہے۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی پانی میں شرابور ذرا جھجکتے ہوئے اندر آتے ہیں)

لڑکا :۔ (اوکسفرڈ لہجے میں) تھنک یُو میم —— موسٹ کائنڈ آف یُو۔ (برساتی اُتارنے میں لڑکی کی

---

[1] قادر [2] علیم [3] مالک کائنات

مدد کرتا ہے پھر اپنی برساتی اُتارتا ہے ــــ لڑکی سنہرے بال، خوبصورت ــــ بیش قیمت امریکن فراک۔ دونوں بہت متموّل معلوم ہوتے ہیں لڑکی کے ہاتھ میں ایک پارسل ہے)۔

لڑکی :۔ (امریکن لہجے میں) معاف کیجئے گا ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ ہم مسز کلثوم زری والا کا بنگلا تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکیں گی؟ (ایک پرچہ دکھاتی ہے۔ ہومائے جواب نہیں دیتی وہ حیرت اور رشک کے ساتھ اس نو عمر حسین اور صحت مند جوڑے کو تکے جا رہی ہے۔ گویا دونوں کسی پُرانے خوشگوار خواب میں سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔ رودابہ فوراً اسٹول سے اُٹھ کر آتی ہے۔ عینک لگا کر لڑکی کے پرچے پر لکھا پتہ پڑھتی ہے)۔

لڑکی :۔ کیبی نے کہا شاید آپ کے ہاں سے معلوم ہو جائے۔ سڑک تو یہی ہے۔

(رودابہ نفی میں سر ہلاتی ہے)۔

لڑکا :۔ بلیاں اور کتے برس رہے ہیں۔ کیا ہم آپ کے ہاں چند منٹ ٹھہر سکتے ہیں؟ ٹیکسی ڈرائیور اس طوفان میں آگے جانے سے انکار کر رہا ہے۔

ہومائے :۔ (چونک کر) اوہ ــــ! یقیناً ــــ اندر آجاؤ ــــ

(لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے پر نظر ڈال کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں)۔

لڑکی :۔ GEE ــــ تھینکس ــــ!!

ہومائے :۔ امریکن ــــ؟

لڑکی :۔ نو میم ــــ ایرانین ــــ

لڑکا :۔ (جھک کر) خانم گلچہر اسفندیاری ــــ داراب کاظم زادے۔

ہومائے
رودابہ } ہاؤ ڈو یو ڈو ــــ

(وہ دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ روشنی میں گلچہر کے لاکٹ پر ہیروں سے بنا "یاعلی" جگمگانے لگتا ہے۔ ہومائے کُرسی پر ٹک کر بلّی کو گود میں اُٹھا لیتی ہے۔ رودابہ سرعت اور احساسِ مصروفیت

کے ساتھ بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔)

ہومائے:۔ تم لوگ کہاں سے آرہے ہو۔؟

داراب کاظم زادہ:۔ آج صبح لندن سے۔ مَیں کیمبرج میں پڑھتا ہوں ـــــ یہ میری کزن اور منگیتر ـــــ گلچہر ـــــ سیرہ لارنس میں زیرِ تعلیم ہے۔ امریکہ میں۔

گلچہر:۔ کالج میں میری ایک انڈین کلاس فیلو ہے ـــــ خدیجہ زری والا ـــــ اس نے ایک پیکٹ اور خط دیا تھا کہ بمبئی میں اس کی والدہ کو دے دوں ـــــ

داراب کاظم زادہ:۔ (کلپڈ برطانوی لہجے میں) مس زرّی والا نے اپنے مکان کا فون نمبر بھی دیا تھا۔ ہم لوگ ایئرپورٹ پر ہوٹل سینٹور میں ٹھیرے ہیں۔ وہاں سے فون کیا مگر بارش کی وجہ سے لائن خراب تھی۔ شام کو ٹیکسی لے کر مکان ڈھونڈنے نکلے۔ (رودابہ چائے کی ٹرے لیے کمرے میں واپس آتی ہے۔) ہم دونوں ـــــ کزن گلچہر اور مَیں ـــــ چھٹیوں میں ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ وطن ہوتے ہوئے اپنے اپنے والدین سے مل کر مغرب واپس جائیں گے۔

ہومائے:۔ وطن ـــــ ؟

داراب:۔ طہران ـــــ ایران ـــــ

ہومائے:۔ اوہ ـــــ آف کورس ـــــ !

(داراب نظریں اُٹھا کر سائیڈ بورڈ کو دیکھتا ہے جس پر شاہ اور شہبانوئے ایران کی تصویر رکھی ہے۔ وہ ذرا تعجب اور مسرّت سے مسکراتا ہے۔ ہومائے چُپ بیٹھی ہے۔ ایسا لگتا ہے شاید مدّتوں بعد گھر پہ مہمان آئے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ان سے کیا بات کرے۔

رودابہ:۔ (چائے کی ٹرے کارڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے) ہومائے! تم نے ہم لوگوں کا تعارف کرادیا؟ ـــــ ینگ مین ـــــ ! میں رودابہ اردشیر جنگ والا ہوں۔ یہ میری بڑی بہن مس ہومائے جنگ والا ـــــ (داراب اور گلچہر مسکرا کر سر خم کرتے ہیں) اور وہ ہمارے والدین ـــــ سر اردشیر کیکاؤس جنگ والا ـــــ لیڈی تہمینہ جنگ والا۔

داراب :- (زیرِ لب) ہاؤ فیسی نیٹنگ ——!

روداب :- (پیانو پر رکھی خوش شکل نوجوان کی تصویر کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہوشنگ سروش یار مرزا —— ہومائے کا منگیتر ——

(ہومائے ذرا شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔ لفظ "منگیتر" پر داراب کاظم زادہ اور گلچہرا اسفندیاری قدرے متحیر نظر آتے ہیں۔ چھت پر کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز۔ دونوں نووارد گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ روداب چائے بناتی ہے)۔

داراب :- تھینکس۔ ہاؤ ویری نائس آف یُو

روداب : یہ تو کیک —— آج ہی ہومائے نے بیک کیا ہے اور کاٹج چیز اور اسکونز میں نے بنائے ہیں۔

داراب کاظم زادہ :- گڈ لارڈ —— ! کاٹج چیز اور اسکونز —! معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی انگلستان ہی میں ہوں !!

ہومائے :- (ہونٹ بچکا کر) ہاہا —— اس مکان سے باہر نکلو گے تو پتہ چلے گا یہاں کے اسٹینڈرڈ کتنے گر گئے ہیں۔ مَیں اُمید کرتی ہوں تم کو مسز پوچ کھانا والا کا بنگلہ مل جائے گا۔ اگر اب تک گرا نہ ہو۔

گلچہرا اسفندیاری :- مسز کلثوم زری والا ——

روداب :- کارٹر روڈ —— ؟

گلچہر :- جی نہیں —— پالی مالا روڈ —— ٹیکسی والا ساری پالی ہل پر لیے پھرا ہوٹل میں کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ جگہ دلیپ کمار کے بنگلے کے نزدیک ہوگی ۔ ایک راہ گیر بولا۔ راجیش کھنہ کے بنگلے کے آگے دائیں ہاتھ کو جو سڑک جاتی ہے۔ میں نے کیبی سے کہا یہ دونوں بنگلے پالی ہل کے لینڈ مارک معلوم ہوتے ہیں تو وہ فوراً بولا —— میڈیم —— لینڈ مارک میں تو مرحومہ مینا کماری رہتی تھیں ——!" (ہنستی ہے)۔ اور راجیش کھنہ کا بنگلہ ——

ہومائے :- (ذرا ناگواری سے) راجیش کھنہ کون ہے ؟

روداب :- ہومائے ڈیر —— راجیش کھنہ ایک انڈین سنیما ایکٹر ہے۔ دلیپ کمار بھی ——

گلچہرہ اسفندیاری:۔ (ذرا جوش سے) دلیپ کمار۔ مینا کماری ـــ وجینتی مالا۔ ممتاز۔ میں ان سب کی مووِیز طہران میں دیکھ چکی ہوں۔ اپنے بچپن میں۔ آئی لَو انڈین مووِیز ـــ میری ممّی نے تو سنگم پانچ مرتبہ دیکھی تھی۔ اور داراب یاد ہے ہمارے بچپن میں وہ انڈین فلم سونگ ہمارے طہران میں کس قدر مقبول تھے "دوست دوست نہ رہا" ـــ اور "میری جان شب بخیر!" ـــ آپ کو یہ گیت آتے ہیں ـــ؟

(روّدابہ نفی میں سر ہلاتی ہے)۔

داراب :۔ گلچہر! میرا خیال ہے کل صبح دن کی روشنی میں تمھاری سہیلی کی والدہ کا مکان تلاش کریں۔ اب ان مہربان خواتین کا شکریہ ادا کر کے چلتے ہیں۔ بارش کا زور کچھ کم ہو رہا ہے۔ (ٹھٹھک کر) ـــ میم ـــ آپ کے ہاں چینی نوادر کا بہت عمدہ ذخیرہ موجود ہے!

ہومائے :۔ (چونک کر، خوشی سے) میرے گریٹ گرینڈ فادر نے چائنا سے تجارت شروع کی تھی۔ ان کے اپنے جنک تھے ـــ سمندری جہاز ـــ

داراب :۔ ہاؤ انٹرسٹنگ ـــ!

ہومائے :۔ (جواب اپنے متعلق بتانے کے لیے دفعتاً بہت بے چین نظر آتی ہے)۔ ڈپریشن سے قبل اس سڑک کے متعدد بنگلے ہمارے خاندان کی ملکیت تھے۔ کریش کے بعد سب بک گئے۔ چین سے ٹریڈ بھی ختم ہو گئی۔

داراب :۔ اور آپ کے والدین ـــ؟

ہومائے :۔ دونوں مر گئے۔

داراب :۔ بہن بھائی ـــ؟

رودابہ :۔ وہ بھی مر گئے ـــ

داراب :۔ دوسرے رشتہ دار ـــ؟

رودابہ :۔ وہ بھی مر گئے۔

داراب :۔ اوہ ـــ آئی ایم سوری ـــ

ہومائے:۔ ٹھیک ہے۔ اس کے متعلق تم کیا کر سکتے ہو — (اوپر چھت پر پھر کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے۔)

گلچہرا اسفندیاری:۔ (چائے کی پیالی ختم کر کے داراب سے) اب اجازت لیں —؟

رودابہ:۔ نہیں نہیں — ابھی بیٹھو — ڈنر کھا کر جانا —

داراب:۔ میم — شکریہ — لیکن بہت رات ہو جائے گی۔ باہر ٹیکسی منتظر ہے۔

رودابہ:۔ ٹیکسی رخصت کر دو۔ ابھی ہوشنگ آنے والا ہے۔ تم کو تمھارے ہوٹل پہنچا آئے گا۔ سانتا کروز یہاں سے زیادہ دُور نہیں۔

ہومائے:۔ (چونک کر) ہمارے پاس ۳۳ء ماڈل کی پیکارڈ ہے۔ پہلے میں اسے چلایا کرتی تھی۔ فراٹے سے۔ ویک اینڈ کے لیے پونا — گرمیوں میں مہابلیشور — ماتھیران — اب میرے گھٹنوں میں گٹھیا کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ پیکارڈ پندرہ برس سے موٹر خانے میں بند پڑی ہے۔ ہوشنگ آجائے میں اس سے کہوں گی تم کو اسی میں تمھارے ہوٹل پہنچا دے۔

داراب:۔ (گھبرا کر) جی نہیں — زحمت نہ کیجیے، ہم ٹیکسی پر چلے جائیں گے۔

ہومائے:۔ (یکلخت سکون سے) اچھا۔ جو تمھاری مرضی۔ ہوشنگ بھی میری پیکارڈ چلانے پر راضی نہیں ہوتا۔ ٹیکسی پر آتا جاتا ہے۔

گلچہرہ:۔ (اب ذرا اُکتا کر) مسٹر ہوشنگ کب آئیں گے۔؟

(ککو کلاک میں سے پرندہ باہر نکل کر سُریلی سیٹی بجاتا ہے)۔

رودابہ:۔ اب آتا ہی ہوگا۔ اسے تاش کی لت ہے۔ روزانہ پابندی سے ولنگڈن کلب جاتا ہے۔ پہلے ٹینس — پھر کارڈز — نو دس بجے تک یہاں آتا ہے — تم لوگ بمبئی میں کب تک ہو —؟ کسی شام ہوشنگ کے ساتھ ولنگڈن کلب ہو آؤ — آج بھی نو دولتوں کے اس بدصورت نئے شہر میں اس کلب کا پُرانا برٹش ماحول برقرار ہے۔ پُرانی نسل کے چند وضع دار جنٹل مین اب بھی دستانے پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے کر وہاں برج کھیلنے آتے ہیں۔

داراب :۔ ہاؤ انٹرسٹنگ ـــــ !

گلچہر :۔ جیسے نیو انگلینڈ کے پرانے کنٹری کلب ـــــ !!

ھوما ئے :۔ یو آر رائٹ ! ـــــ میں بھی جنگ سے پہلے والدین کے ساتھ امریکہ گئی تھی۔ اس سے بھی کئی سال قبل ماما جب پہلی بار پاپا کے ساتھ امریکہ گئیں ـــــ ہالی وڈ میں رڈولف ویلنٹینو نے اپنے ہاتھ سے ان کو اپنی تصویر بھی دی تھی ـــــ دکھاؤں ـــــ ؟ (اٹھتی ہے)

گلچہر :۔ مائی گوڈ ـــــ !

رودابہ :۔ اب وہ تصویر کہاں تلاش کرو گی۔ چھوڑو ـــــ

ھومائے :۔ (پھر بیٹھ جاتی ہے اب داراب کو مخاطب کر کے ہم دونوں بہنوں نے سوئٹزرلینڈ میں فنشنگ اسکول کیا۔ ہوشنگ نے تمھاری طرح اوکسفرڈ میں پڑھا تھا۔

داراب :۔ مَیں کیمبرج میں ہوں۔

ھومائے :۔ نیور مائنڈ ـــــ اچھا ذرا میں کچن میں ہو آؤں ـــــ اکسکیوز می ـــــ (اٹھ کر بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔ رودابہ اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ دریچے کے باہر طوفانِ باد و باراں کی گرج ـــــ سمندر کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔ داراب اُٹھ کر دریچے سے باہر جھانکتا ہے۔ پھر آہستہ سے) افوہ کتنا گھپ اندھیرا ہے۔ مَیں نے ایسی تاریک رات کبھی نہیں دیکھی۔ انڈین مونسون کی رات۔ ! سمندر۔ بادل اور رات سب گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔

(گلچہر ذرا خوفزدہ ہو کر داراب کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے۔ احساسِ تحفظ کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)۔

گلچہر :۔ داریوش ـــــ !

داراب :۔ (گھبرا کر) ارے ہماری کیب غائب ہو گئی۔ ؟

گلچہر :۔ (کھڑکی سے باہر جھانک کر) نہیں ـــــ نیچے پورٹیکو میں کھڑی تو ہے۔ کیا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ (ذرا توقف کے بعد) اس طرح کے قدیم شاندار جارجین مکان جنوبی اسٹیٹس میں بھی موجود ہیں۔

کوٹن پلانٹیشنز پر —— ہماری میزبان کہاں چلی گئیں —— ؟

داراب:۔ بے چاریاں ہمارے لیے ڈنر کا انتظام کرنے گئی ہیں۔

گلچہر:۔ ڈیلائٹ فل اولڈ لیڈیز —— سوکیوٹ —— بالکل پھدکتی ہوئی چڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

داراب:۔ (افسردگی سے) گلچہر —— بڑھاپے کا مذاق نہ اُڑاؤ —— کبھی ہم اور تم بھی بوڑھے ہوں گے —— اگر زندہ رہے ——

گلچہر:۔ (ندامت سے) آئی ایم سوری —— ہنی ——

داراب:۔ (سوچتی ہوئی آواز میں —— آہستہ آہستہ) انسانوں کی طرح نسلیں بھی بوڑھی ہو جاتی ہیں —— کیمبرج میں ایک مرتبہ میرے ایک انڈین پادری دوست نے بتلایا تھا کہ اس وقت ساری دنیا میں پارسیوں کی تعداد السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا کی سرکولیشن سے ایک تہائی کم ہے!

گلچہر:۔ گڈ گوڈ!

داراب:۔ آج تیسرے پہر جب ہم لوگ سیر کرتے مالابار ہل کی ڈھلوان پر سے آ رہے تھے۔ راستے میں ٹیکسی ڈرائیور نے ایک گھنے سرسبز جنگل کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ اس میں پارسی لوگ کا دُخمہ ہے۔

یاد ہے —— ؟

گلچہر:۔ ہاں ——

داراب:۔ اس وقت مجھے ایک خیال آیا —— پسارگارد —— پرسی پولس۔ طاقِ کسریٰ —— اور آخر میں فقط مالابار ہل بمبئی کا دُخمہ —— ! لارڈ! —— واٹ این اینٹی کلائمکس!

گلچہر:۔ ہاؤ سیڈ ——

داراب:۔ نہیں —— رنج نہ کرو —— ہم تو زندہ ہیں اور ہماری قدیم تہذیب کے خالق یہ غیر معمولی لوگ بھی باقی رہیں گے۔

(بارش دفعتاً تھم جاتی ہے۔ دریچے کے باہر مدھم سی دُودھیا روشنی آہستہ آہستہ تیز ہوتی ہے)

داراب :- گلچہر ـــــ دیکھو بادل ذرا سے چھٹے اور چاند نکل آیا ـــــ ماہِ کامل۔ سامنے والے بنگلے کے پیچھے بادلوں میں سے نمودار ہونا کتنا فسوں خیز معلوم ہو رہا ہے۔ بالکل جیسے کانسٹبل کی ایک پینٹنگ ـــــ کبھی یہ جگہ بے حد خوبصورت رہی ہوگی ـــــ

گلچہر :- ٹیکسی ڈرائیور کہہ رہا تھا صرف دس برس پہلے تک سارے پالی ہل پر انتہائی پکچریسک بنگلے موجود تھے۔ اب سب غائب ہوتے جا رہے ہیں انھیں گرا کر ان کی جگہ اسکائی اسکریپر بنا دیے گئے ـــ

داراب ! میں امریکہ سے ہندوستان اسکائی اسکریپر دیکھنے تو نہیں آئی۔ کل ہی چلو بمبئی سے۔

داراب :- ڈارلنگ ـــــ ہم لوگ اصل ہندوستان کی سیر کے لیے پرسوں صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ جے پور۔ آگرہ۔ دلّی۔ کھجوراہو ـــــ دی ورکس ! اکتاؤ نہیں ـــــ

(باہر مینہ پھر برسنے لگتا ہے۔ ہومائے اور رودابہ دو کشتیاں اُٹھائے کمرے میں واپس آتی ہیں۔ کشتیاں جن میں ڈھکے ہوئے ڈونگے چنے ہیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اپنی اپنی جگہ واپس بیٹھتی ہیں۔ داراب اور گلچہر دریچے سے ہٹ کر صوفے کی طرف آتے ہیں۔ ہومائے اپنے ہاتھوں کو دھیان سے دیکھ رہی ہے)۔

داراب :- مادموزیل ـــ آپ دونوں کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں۔ ارسٹوکریٹک ـــــ چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ جنھوں نے کبھی کام نہیں کیا۔ سوائے پیانو بجانے اور کشیدہ کاری کے ـــ !

(دونوں بہنیں تشکر آمیز نگاہوں سے داراب کاظم زادہ کو دیکھتی ہیں۔)

ہومائے :- (ذرا بھرائی ہوئی آواز میں) پیارے نوجوان آدمی تم بہت مہربان ہو ـــــ اور بہت مہذب ـــــ لیکن ہمارے بٹلر کُک، میڈ، سب کب کے رُخصت ہوئے ـــ عرصے سے ہم دونوں خود ہی کھانا پکاتے ہیں۔ خود گھر کا سارا کام کرتے ہیں۔

داراب :- (خلوص سے) اب ہمارے لیے مزید تکلیف نہ اُٹھائیے ـــ ہم اپنے ہوٹل میں واپس جا کر۔

ہومائے :- نہیں نہیں ـــــ ہوشنگ آنے والا ہے ـــــ ہم سب کے ساتھ ڈنر میں شریک ہو ـــــ پلیز ـــ !

داراب:- بہت خوب — شکریہ — (کمرے میں ٹہل ٹہل کر سامانِ آرایش دیکھنے لگتا ہے۔ پھر سرارد شیر اور لیڈی جنگ والا کی روغنی اکیڈیمی تصاویر کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔)

ھومائے:- (فخر سے) ہمارے پاپا اور ماما! (رومال سے آنکھیں خشک کرتی ہے)۔

داراب:- جی ہاں — آپ نے بتایا تھا — (بیٹھ جاتا ہے)۔

ھومائے:- دی ایئر نائنٹن تھرٹی فور میں جب پاپا دیوالیہ ہوئے، انھوں نے بھری برسات کی ایک ایسی ہی اندھیری رات اسی کمرے میں تولیہ سر پر لپیٹ کر اپنی کنپٹی پر پستول چلا دیا تھا — (گلچہر خفیف سا لرز کر داراب کو دیکھتی ہے) کچھ عرصے بعد ماما شدتِ غم سے چل بسیں — دستور جمشید جی ہمارے فیملی پریسٹ نے ہمیں سمجھایا — روءمت — ہاؤدخت نسخ میں لکھا ہے: "خدا اور اس کے پیغمبر[1] کا ارشاد ہے کہ مرنے والے کی مَوت پر رونا گناہ ہے۔ جب مرنے والا عالمِ نزع میں ہوتا ہے دیواستاگ واد اس کی رُوح قبض کرنے آتا ہے۔ بالا روانے کیکاؤس جس نے آسمان پر پرواز کرنے کی کوشش کی تھی۔ دیواستاگ واد کے پنجے سے نہ بچا — نہ افراسیاب شاہِ توران جس نے مَوت سے بھاگنے کی سعی میں سمندر کی تہہ میں آہنی محل بنوایا تھا —" ماما کی لاش کے لیے زمین پر بستر بچھایا گیا سروش باج کی تلاوت ہوئی — سگ دید کروائی گئی۔ کفن پہنایا گیا — دستور لوگ پشت گاہاں کے لیے تیار ہوئے — دُخمے میں میت چڑھا کر دروازہ مقفل کیا گیا — پسماندگان نے بعد وضو نمازِ دُخمہ ادا کی — تین رات تک ہمارے گھر میں اور دُخمے کے نزدیک چراغ جلا — جانتے ہو — ؟ اگر ان تین راتوں میں اوستا پڑھی جائے تو سروش[2] رواں کی مدد نہیں کرتا — رواں کے لیے پہلی تین راتیں بہت بھاری ہیں۔ جو اسے نوہزار ۹۰۰۰ راتیں معلوم ہوتی ہیں۔ انبوہ در انبوہ دیو آ کر اسے ڈراتے ہیں۔ لیکن انہی تین راتوں میں سروش پُل[3] پر اس کی رہبری

---

[1] حضرت زرتشت

[2] ایک فرشتہ [3] اوستا: پرتو — پہلوی: پوہر — فرانسیسی: پوں —

کرتا ہے ـــــ نیک رواں کو اینناسپند پل چنوات پر سے گزار لے جاتے ہیں۔ مقدس ارواح اور فردوس کی حوریں پل کے سرے پر زرمایہ[1] روغنا سے اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ وہ تاقیامت مسرور رہتی ہے۔ چوتھے روز طلوعِ آفتاب سے قبل آفرنگاں کی تلاوت کی گئی تاکہ رواں برزخ میں سے نکل جائے ـــــ دستور آدھی رات کو آکر گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر پسماندگان کو اطلاع دیتے ہیں ـــــ اب متوفی کی رواں فلاں مقام پر ہے ـــــ اب فلاں جگہ پہنچ چکی ہے ـــــ پاپا اور ماما کے لیے بھی انھوں نے یہی کیا داراب ـــــ! مجھے یقین ہے پاپا اور ماما کی روحیں اب فردوس بریں میں موجود ہوں گی ـــــ (رومال سے پلکیں خشک کرتی ہے۔)

داراب :۔ (چند لمحوں بعد، گہری آواز میں) مجھے بھی یقین ہے مادموزیل۔

(خاموشی کا مختصر وقفہ ـــــ معاً چھت پر کھٹ کھٹ از سرِ نو شروع ہو جاتی ہے ـــــ دونوں ایرانی مہمان گھبرا کر اوپر دیکھتے ہیں۔)

گلچہرہ :۔ (کھنکار کر) معاف کیجیے گا ـــــ میم ـــــ کیا بالائی منزل پر کرائے دار رہتے ہیں۔؟

(دونوں بہنیں متوحش ہو کر ایک دوسرے پر نظر ڈالتی ہیں۔)

ھومائے :۔ (رودابہ سے) انھیں بتلادوں؟

(اسٹیج کے باہر ونگ میں کسی کے زینہ اُترنے کی آواز ـــــ کھٹ کھٹ دائیں دروازے میں ایک بیحد ضعیف پارسن آسیب کے مانند نمودار ہوتی ہے۔ سفید لیس کا بلاوز ـــــ سفید ریشمی ساری جس کی سیاہ مخملیں بیل پر رنگ برنگے پھول بنے ہیں۔ ہیرے کا بروچ۔ گوشوارے ـــــ سچے موتیوں کی مالا ـــــ جالی کے سفید دستانے ساٹن کے سبک سفید سینڈل۔ دائیں ہاتھ میں رنگین پیراسول ـــــ معلوم ہوتا ہے گویا سیدھی بکھنگم پیلیس کی گارڈن پارٹی سے واپس آرہی ہیں ـــــ عمر تقریباً بہ بجا نوے سال ـــــ

---

[1] موسم بہار میں تیار کیا ہوا مکھن

ضعیفہ :- (جھرجھری آواز میں) ہومائے ـــــ! روداَبہ! ـــــ سروش کسی کی مدد نہیں کرتا ـــــ نہ بہرام[1] ـــــ نہ خود اہرمزد ـــــ اس دھوکے میں بھی نہ رہنا ـــــ سمجھیں ـــــ؟ سب عالمِ برزخ ہی برزخ ہے۔ یا جہنم ـــــ فردوس کہیں نہیں ہے ـــــ سمجھیں ـــــ؟ باقی یہ کہ وہ پل پر مہر داور کے سامنے پہنچ چکا ہے اور اب اس کا اور میرا مقدمہ مہر یزد کے سامنے پیش ہونے ہی والا ہے ـــــ آدھی رات کو تمھیں یہ اطلاع دینے آئی ہوں ـــــ گڈ نائٹ ـــــ

(ضعیفہ کھٹ کھٹ چلتی اسٹیج پر سے گزر جاتی ہے ـــــ گلچہر سہم کر داراب سے لپٹ گئی ہے ـــــ روداَبہ اور ہومائے بھونچکی بیٹھی ہیں۔ باہر زنگ میں سیڑھیاں چڑھنے کی آواز ـــــ کمرے میں سناٹا ـــــ)

روداَبہ :- (سنبھل کر) آئی ایم سوری ـــــ یہ بیچاری ہماری دیوانی آنٹ فیروزہ ہیں ـــــ سابق لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر ـــــ اوپر کی منزل پر رہتی ہیں ـــــ بالکل تنہا ـــــ دماغ چل گیا ہے لیکن پچانوے ۹۵ سال کی عمر میں کیا قابلِ رشک صحت ہے ـــــ سارے وقت پیراسول کی نوک سے فرش کھٹکھٹایا کرتی ہیں ـــــ چوبی چھت ہے اس وجہ سے آواز صاف آتی ہے ـــــ ہمیں تنگ کرنا ان کا اصل مقصد ہے۔ (داراب اور گلچہر ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں۔)

ہومائے :- میرا خیال ہے ہوشنگ کے آنے سے قبل تم دونوں کو بیچاری کریزی آنٹ فیروزہ کا قصہ سنا ہی دوں۔

روداَبہ :- (ڈانٹ کر) نہیں ہومائے ـــــ خاموش رہو ـــــ

ہومائے :- ہرگز نہیں۔ ضرور سناؤں گی ـــــ (داراب اور گلچہر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھتے ہیں۔ ہومائے لپک کر داراب کا بازو پکڑ لیتی ہے اور غیر معمولی طاقت سے دونوں نوجوانوں کو ڈھکیلتی دریچے کے پاس لے جاتی ہے) وہ سامنے جلا ہوا کھنڈر دیکھتے ہو ـــــ؟

---

[1] ایک مددگار رہبر فرشتہ

املتاس کے اُدھر —— ؟

داراب:۔ (ہکلاکر) جی —— جی ہاں ——

ہومائے:۔ یہ لیڈی فیروزہ کا مکان تھا۔ (داراب عادتاً "ہاؤ انٹرسٹنگ" کہنا چاہتا ہے مگر سہم کر رک جاتا ہے)۔ آنٹ فیروزہ ہماری والدہ کی دور کی رشتے دار تھیں۔ امیر کبیر ماں باپ کی اکلوتی —— دی ایرنائنٹین ناٹ فائیو میں جب اپنے سوئس اسکول سے واپس آئیں یوروپ سے —— ان کی شادی سرفریدوں جی ڈائمنڈ کٹر سے کر دی گئی۔ سرفریدوں بلجیم سے ہیروں کی تجارت کرتے تھے۔

رودابہ:۔ شادی کے اٹھارہ اُنیس سال بعد وہ مر گئے —— لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر ایک کروڑ پتی لاولد بیوہ رہ گئیں ——

ہومائے:۔ ہوشنگ سروشیار مرزا میرا لڑکپن کا دوست تھا —— مگر اس کے ماں باپ معمولی لوگ تھے۔ باپ ایک بنک میں ہیڈ کلرک —— سرار دشیر جنگ والا کی لڑکی سے اس کی شادی ناممکن —— وہ ہمارے تعلیمی ٹرسٹ سے وظیفہ حاصل کر کے پڑھنے کے لیے ولایت چلا گیا تاکہ واپس آکر کچھ بن سکے اور مجھے بیاہ لے جائے اس دوران میں ڈپریشن ہوا —— پاپا ماما مرے —— ہمارا اپنا گھر تباہ ہو گیا۔

رودابہ:۔ دی ایرنائنٹین تھرٹی ایٹ میں ہوشنگ ولایت سے لوٹا —— مگر قسمت خراب تھی۔ حسب دلخواہ ملازمت نہیں ملی۔ تین سال بیکار رہا ——

ہومائے:۔ تب ایک شام اسی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے مجھ سے کہا —— "ہومائے —— اجازت دو کہ میں لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر سے شادی کر لوں بڑھیا بیمار رہتی ہے چند سال میں لڑھک جائے گی۔ پھر ہم تم اپنا گھر بسا لیں گے —— اس وقت تم اور ہم دونوں افلاس کے شکار ہیں۔ اور اپنی مالی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کا یہ واحد اور سہل ترین نسخہ ہے ——" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور میں گم سم رہ گئی۔ وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر زینہ اُتر کر پورٹیکو سے نکلا اور لیڈی ڈائمنڈ کٹر کے بنگلے کی سمت روانہ ہو گیا۔

رودابہ:۔ ٹرف کلب میں دعوت ہوئی —— دستوروں نے مقدس منتر پڑھ کر دونوں کو ایک

دوسرے کا کدخدا[۱] اور کدبانو[۲] بنادیا اور وہ ہمارا "انکل ہوشنگ" بن گیا ـــــ آنٹ فیروزہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں ـــــ اس عمر میں ایسا خوبصورت نوجوان شوہر مل گیا ـــــ ناقابل یقین خوش نصیبی۔

ھوماۓ :۔ بنام[۳] ایزد ـــــ! ہوشنگ کتنا شکیل اور طرحدار تھا ـــــ! اب ہم سب نے مل کر آنٹ فیروزہ کے انتقال کا انتظار شروع کیا ـــــ شادی کے وقت ان کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی ـــــ گلچہر! ـــــ اُس وقت مَیں تمھارے ہی برابر رہی ہوں گی ـــــ اور ہوشنگ بالکل تمھارے داراب جیسا تھا ـــــ!

(گلچہر اور داراب لرز کر ایک دوسرے کا ہاتھ زیادہ مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔)

داراب :۔ لیکن آنٹ فیروزہ جیتی ہی چلی گئیں ـــــ پینسٹھ سال، ستر سال، اسّی سال اور بے چارہ ہوشنگ وفادار ملازم کی طرح خدمت میں حاضر ـــــ آنٹ فیروزہ کا حکم تھا وہ چوری چھپے بھی ہم سے نہ ملے۔ ہمارے اور اس کے پیچھے پرائیویٹ جاسوس لگا رکھے تھے ـــــ اور خبردار کردیا تھا کہ اگر ہوماۓ سے ملتا پایا گیا تو وہ اپنی ساری دولت اس کے بجائے کسی خیراتی ادارے کو دے جائیں گی ـــــ

ھوماۓ :۔ تب عاجز آکر بے چارے ہوشنگ نے اپنی قسمت سے انتقام لینا شروع کیا ـــــ وہ آنٹ فیروزہ کا روپیہ بیدردی سے اُڑانے لگا ـــــ ریس کورس، جُوا ـــــ شراب ـــــ سٹّہ ـــــ وہ اسے بھاری بھاری چیک کاٹ کر دیا کیں تاکہ خوش رہے۔

داراب :۔ جب آنٹ فیروزہ اکیاسّی کی ہوکر بیاسّی میں لگیں ہوشنگ ان کو تقریبًا کنگال کرچکا تھا۔ پھر اس نے آنٹ فیروزہ کی اکیاسیویں سالگرہ بڑی دھوم سے منائی۔ سامنے والے بنگلے میں زوردار پارٹی ہوئی ـــــ کیک پر ۸۱ کے بجائے ۱۸ موم بتّیاں لگائی گئیں۔ شہر کا بہترین ڈانس بینڈ آیا۔ ہم دونوں بہنیں اسی کھڑکی میں سے نظارہ دیکھتی رہیں۔

ھوماۓ :۔ اچانک بنگلے میں سے مہیب شعلے بلند ہوئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا ـــــ آگ ـــــ! آگ ـــــ!! کسی نے آکر کہا کہ برتھ ڈے کی ایک موم بتّی سے اتّفاقیہ آگ لگی۔ فائر انجن آتے آتے

---

[۱] شوہر [۲] بیوی [۳] ماشاءاللہ۔

تین منزلہ بنگلہ جل کر خاک ہوگیا ـــــ لیکن آنٹ فیروزہ تب بھی زندہ بچ گئیں ـــــ آگ ہوشنگ ہی نے لگائی تھی۔

رودابے:۔ وہ بھی بچ گیا۔ فوراً رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلا ـــــ روپوش ہوگیا۔ لیکن ڈرائینگ روم کے ملبے میں پڑی، دعوت میں آئے ہوئے کسی DATE CRASHER گمنام اجنبی کی لاش کو آنٹ فیروزہ ہوشنگ سمجھیں۔ اتفاق سے وہ بدقسمت اجنبی ہوشنگ کا ہم شکل تھا ـــــ آنٹ فیروزہ نے فوراً ایک آرٹسٹ بلوا کر جلد از جلد اس کا ڈیتھ ماسک بنوایا ـــــ پھر لاش کی آخری رُسوم ادا کی گئیں ـــــ اخباروں میں چھپا کہ مسٹر ہوشنگ سروشیار مرزا اس خوفناک آتش زدگی میں نہایت ٹریجک طور سے ـــــ جب وہ دھڑا دھڑ جلتے عالیشان ایوانِ نشست سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے ـــــ (اور میزبان خاتون اور سارے مہمان اور ملازم بخیریت باہر نکلنے میں کامیاب رہے تھے) ـــــ جلتے ہوئے مخملیں پردوں کے انبار میں پھنس کر جاں بحق تسلیم ـــــ

ھومائے:۔ (اُنگلی اُٹھا کر رازدارانہ انداز میں) لیکن مجھے اور روڈی کو اصلیت معلوم ہے۔ وہ خبر غلط تھی۔ دُنیا کو دھوکا ہوا ـــــ آنٹ فیروزہ کو دھوکا ہوا ـــــ وہ اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ ہوشنگ اس خوفناک رات جل کر بھسم ہوگیا۔

رودابے:۔ اُن کا محل نُما بنگلہ راکھ ہوچکا تھا ـــــ اور ہم لوگوں کے سوا ان کا کوئی رشتے دار زندہ نہ تھا ـــــ ہوشنگ سے بیاہ کرنے کے بعد وہ پچھلے بیس برس سے ہم سے قطع تعلق کر چکی تھیں ـــــ مگر اس نازک وقت میں ہم دونوں اظہارِ افسوس کے لیے یہ سیڑھیاں اُتر کر راکھ کے ڈھیر پر پہنچے ـــــ وہ املتاس کے نیچے ایک ادھ جلی کُرسی پر خاموش بیٹھی تھیں ـــــ چاروں طرف ان کا آتش زدہ بیش قیمت ساز و سامان بکھرا پڑا تھا ـــــ ڈیتھ ماسک ان کی گود میں رکھا تھا اور اس وقت وہ تقدیر کی خوفناک دیبی معلوم ہو رہی تھیں ـــــ

ھومائے:۔ لیکن آخری قہقہہ ہمارا تھا۔ ہم نے بحیثیت رشتہ دار اُن سے درخواست کی کہ وہ ہمارے یہاں آجائیں ـــــ آنٹ فیروزہ اپنے تکبر اور نخوت کے لیے مشہور تھیں ـــــ اُنھوں نے مغرور

شعلہ بار نگاہوں سے ہمیں دیکھا پھر دیتھ ماسک کی طرف اشارہ کر کے اپنی شاہانہ، جھرجھری آواز میں آہستہ سے بولیں ——

"ہومائے —— رودابہ —— یہ بدنصیب مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں جس لمحے "ہیپی برتھ ڈے" گاتے مہمانوں د بھیڑ کے پیچھے چھپ کر موم بتی کی لَو سے پردے کو آگ لگا رہا تھا میں نے اسے دیکھ لیا تھا —— مگر اب بھی اسے نجات نہیں ملی۔ اس کی رواں نکلتے نکلتے اپنے پیچھے اپنے نقوش چھوڑ گئی ہے ——" انھوں نے ڈیتھ ماسک اوپر اٹھایا پھر گود میں رکھ لیا اور خاموش ہو گئیں ——

رودابہ:۔ اس کے بعد وہ مع اس ڈیتھ ماسک اور اپنے باقیماندہ سامان چپ چاپ ہمارے یہاں دوسری منزل پر منتقل ہو گئیں —— ہمارے ساتھ تعلقات حسبِ معمول منقطع —— ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو کرائے کی رقم کا لفافہ دروازے کی دراز میں سے اندر سرکا دیتی ہیں ——

ہومائے:۔ کچھ عرصے بعد وہ موت کا چہرہ بھی ان کے بیڈروم سے چوری ہو گیا —— وہ عبادت کے لیے آتش کدہ گئی ہوئی تھیں —— واپس آئیں تو چہرہ غائب اس کے بعد سے وہ بالکل باؤلی ہو چکی ہیں —— (زور سے ہنستی ہے)

داراب:۔ مسٹر ہوشنگ مرزا اب کہاں ہیں ——؟

ہومائے:۔ میرا ہوشنگ بہت چالاک ہے —— وہ بھیس بدل کر کولابہ میں مقیم ہے —— اپنی شامیں ولنگڈن کلب میں گذارتا ہے —— سنیچر کی رات کو چپکے سے آکر ہمارے ساتھ کھانا کھاتا ہے اور پھر کولابہ واپس چلا جاتا ہے —— آج سنیچر کی رات ہے —— (ککوکلاک کی چڑیا سیٹی بجاتی ہے —— کُوکُو —— کُوکُو —— کُوکُو ——) لو وہ آگیا۔

(ہومائے فوراً باہر جاتی ہے —— رودابہ پیانو کا اسٹول گھما کر تیزی سے "ویڈنگ مارچ" بجانا شروع کر دیتی ہے۔ چند منٹ بعد ہومائے ایک وحیل چیر ڈھکیلتی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کرسی پر ایک مومی پُتلا سیاہ سوٹ پہنے بیٹھا ہے اس کے سفید موی ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھے ہیں جیسے

پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھینچواتے وقت رکھتے تھے۔ پتلے کی گردن پر خوبرو آنجہانی ہوشنگ ہوشیار مرزا کا ڈیتھ ماسک فٹ کر دیا گیا ہے۔ مرحوم کا مرتے وقت استہزائیہ تبسم پلاسٹر آف پیرس میں خوفناک انداز میں منجمد ہے۔

خانم گلچہرا اسفندیاری
آغائے داراب کاظم زادہ } دہشت زدہ ہو کر چیختے ہیں ـــــــ یا علی ـــ!

(دونوں اُٹھ کر بھاگتے ہیں ــــ بائیں دروازے سے سرپٹ باہر نکل جاتے ہیں۔ رودابہ پیانو کے پردوں پر سر جھکائے جوش و خروش سے "وڈنگ مارچ" بجا رہی ہے۔ ہومائے پتلے کے گلے میں نیپکن باندھتی ہے ــــ سائیڈ بورڈ پر رکھے شمعدان میں موم بتیاں جلانے کے بعد شمعدان ڈائننگ ٹیبل کے وسط میں لا کر رکھ دیتی ہے اور بجلی کی روشنی کا سوئچ آف کرتی ہے)۔

ہومائے:۔ (صوفے اور پیانو کے طرف سے پشت کئے پتلے کے سامنے گلاس رکھتے ہوئے)۔

گلچہر! داراب! ڈنراز سروڈ ــــ مجھے امریکنوں کا یہ رواج بہت پسند ہے ــــ موم بتیوں کی روشنی میں طعام شب ــــ! اس قدر رومینٹک ــــ!!

(رودابہ فوراً پیانو پر FAERY WALTZ بجانا شروع کر دیتی ہے۔ ہومائے پتلے کے سامنے ڈونگے چُنتی ہے۔ اب رودابہ MOON LIGHT SONATA بجانے میں مصروف ہے۔ چند منٹ بعد وہ اُٹھ کر وہ میز کی سمت آتی ہے ــــ دونوں بہنیں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھتی ہیں۔ بیچ میں پُتلا اپنی وھیل چیئر پر ذرا سا ترچھا ہو گیا ہے۔ تینوں کی پرچھائیاں شمعوں کی روشنی میں دیوار پر پھیل گئی ہیں۔

ہومائے اور رودابہ:۔ (سر جھکا کر ایک ساتھ دعائے طعام پڑھتی ہیں)۔ اتا یزامیدے ـــ اہرمزد ــــ جس نے گاؤ، اناج، درختوں اور آب کی تخلیق کی ــــ ہر لقمے کے ساتھ خورداد[1] اور امرداد[2] کی برکت نازل ہو ــــ اور یہ کھانا نوش[3] کی مانند ہو اور عقل اور ذہانت عطا کرے

---

[1] [2] فرشتوں کے نام

[3] شہد

گرنہ شکستہ صد ہزار بار ـــــ

ہومائے :۔ (سر اُٹھا کر صوفے کی طرف مڑتی ہے) داراب! ـــ گلچہر ـــ! آؤ ـــ ارے ـــ یہ دونوں کہاں چلے گئے ـــ؟

رودابہ :۔ (چونک کر) چلے گئے ـــ؟ (رک کر) اب مجھے ان کے متعلق شبہ ہو رہا ہے ـــ آخر یہ دونوں تھے کون ـــ؟

ہومائے :۔ نیور مائنڈ ـــ کوئی پاگل لوگ تھے ـــ کھانے کے لیے اتنا روکا اور اس آندھی اور طوفان میں نکل بھاگے ـــ کریزی فارنرز ـــ

رودابہ :۔ ہاں ـــ آج کل پاگلوں کی دُنیا میں کمی نہیں ـــ نہ جانے کیسے کیسے خبط الحواس آجاتے ہیں ہمارا وقت ضائع کرنے ـــ (اچانک خوفناک قہقہہ لگا کر) اچانک غائب ـــ بھُوت تو نہیں تھے ـــ؟

ہومائے :۔ کریزی فارنرز ـــ پاگل ـــ خیر ـــ ہوشنگ ڈیر ـــ یہ سوپ لو ـــ (چمچے سے سوپ نکال کر ڈیتھ ماسک کے ہونٹوں تک لے جاتی ہے ـــ موت کا چہرہ اپنی لرزہ خیز منجمد مسکراہٹ کے ساتھ بھیانک زاویے سے پلیٹ پر آگے کو جھُک آتا ہے۔ باہر بارش اور طوفان بڑھتا جا رہا ہے ـــ بلّیوں کے رونے کی آواز ـــ بجلی کی چمک ـــ سمندر کی گرج ـــ دریچے میں سے ہوا کا تیز جھونکا اندر آتا ہے جس کی وجہ سے موم بتیاں جھلملا کر بُجھ جاتی ہیں ـــ اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے ـــ اس تاریکی میں ہومائے اور رودابہ باری باری چمچوں سے ڈیتھ ماسک کے منہ پر سوپ انڈیل رہی ہیں ـــ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔)

سلام بن رزاق

بھوگ

اور پھر نارد نے والیا سے پوچھا۔

”تو یہ کُکرم کِس کے لیے کرتا ہے؟“

والیا نے نیزے کو اپنے ہاتھوں پر تولتے ہوئے جواب دیا۔

”اپنے بیوی بچّوں کے لیے۔“

نارد مضحکہ اُڑانے والے انداز میں ہنسے۔ والیا انھیں سُرخ آنکھوں سے گھُورتا ہوا بولا۔

”کیوں؟ تو کیوں ہنسا۔“

”تیری مورکھتا پر۔“

والیا نے نیزہ فضا میں بلند کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

”بتا کیوں ہنسا۔ ورنہ بیندھ کر رکھ دوں گا۔“

نارد اسی پُرسکون انداز میں بولے۔

”پیچ میں تیری مورکھتا پر ہنس رہا ہوں۔ کیوں کہ تیرے چاروں طرف گھور اندھکار پھیلا ہے اور تو نہیں جانتا کہ تجھے کدھر جانا ہے۔ تو جن لوگوں کے لیے یہ کُکرم کر رہا ہے۔ وہ سب اپنے اپنے سوارتھ کے لیے تجھ سے بندھے ہوئے ہیں۔ جب تجھ سے ان پاپوں کا حساب

مانگا جائے گا۔ اُس وقت نہ تیری بیوی تیرے کام آئے گی نہ تیرے بچّے۔"

" ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مَیں جو کچھ کر رہا ہوں اُن کے سُکھ اور آرام کے لیے کر رہا ہوں۔ جب اس کا بھگتان ہوگا وہ سب میرے ساتھ ہوں گے۔"

" جا! جا کر اپنی بیوی، بچّوں سے پوچھ کر آ کہ وہ لوگ تیرے کرموں کے ساجھی دار ہیں یا نہیں؟"

والیا اپنی گپھا میں لَوٹ گیا۔ بیوی، بچّے اور دوسرے گھر والوں سے باری باری پوچھا کہ کیا وہ لوگ اس کے کرموں کے ساجھی دار ہیں؟" جیسا کہ رامائن میں آگے لکھا ہے۔ وہ سبھی لوگ نفی میں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں " تیرے کرم تیرے ساتھ۔ ہم تو کیول تیرے دھن، سادھن کے بھوکتا ہیں۔"

والیا یہ جواب سُن کر کانپ جاتا ہے اور یہ کہانی پڑھتے پڑھتے وہ خود بھی کانپ گیا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی اور دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی۔ جانے اس چھوٹی سی کتھا میں ایسا کیا تھا کہ یک بیک وہ بے حد مضطرب ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی۔ اسے لگا وہ اپنے فلیٹ کے ڈرائینگ روم میں نہیں ہزاروں برس سے بندھیاگری کے گھنے جنگل میں کھڑا ہے اور ایک غیبی آواز اس کے چاروں طرف ہواؤں کے دوش پر سرسراتی پھر رہی ہے۔

" کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟"

" کیا تیرے بیوی بچّے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟"

اور پھر جیسے سیکڑوں چڑیلیں ایک ساتھ چنگھاڑتی ہیں۔

" نہیں — نہیں — نہیں — نہیں۔"

کمرے میں رکھے ٹی وی سیٹ سے نارد کا چہرہ جھانکتا ہے۔ گلے میں تنبورا لٹکائے منجیرا بجاتے نارد کی آواز آتی ہے۔

" نا — را — ین، — نا — را — ین — کیا تیرے بیوی بچّے تیرے

کرموں کے ساجھی دار بنیں گے ۔؟"

دیوار پر ٹنگی اٹالین گھڑی کا پنڈولم ہلتا ہے ۔

"نہیں ——— نہیں ——— نہیں ——— نہیں ——— "

گودریج کی فولادی الماری، ڈرائننگ ٹیبل، کرسیاں، فرج، ایکویریم، بلجمی گلاس کا شوکیس، ریڈیوگرام، چھت میں لٹکتا شمع دان، دیواریں، کھڑکیاں، کھڑکیوں میں لٹکتے نائلانی پردے، غرض کمرہ، کمرے کی ہر چیز اس سے بس ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی۔

"کیا تیرے بیوی بچے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے ؟"

اور دیوار پر ٹنگی گھڑی کا پنڈولم متواتر ایک ہی لَے میں ہل رہا تھا۔

نہیں، نہیں ——— نہیں، نہیں ——— "

اس نے رامائن بند کردی۔ پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ رامائن کو بند کرکے میز پر ایک طرف رکھ دیا ——— اچانک الماری کے قدآدم شیشے میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ بدن پر لنگوٹی، داڑھی اور بال بے تحاشا بڑھے ہوئے سُرخ آنکھیں، ہاتھ میں چمکتا نیزہ ——— اُف ——— والیا! اس نے خوف سے آنکھیں میچ لیں۔ اتنے میں اس کی بیوی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔

"اچھا تو میں چلتی ہوں ——— آپ کے لیے کھچڑی بنا دی ہے۔ دہی فرج میں رکھا ہے"۔

بیوی اپنی ساڑی کی چنٹیں ٹھیک کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ چند لمحے ہونقوں کی طرح بیوی کی طرف دیکھتا رہا ——— اچانک بولا ——— "سنو!"

بیوی جاتے جاتے رک کر مُڑی "کیا ہے ؟"

اس نے دھیان سے دیکھا۔ بیوی نے وہی ساڑھے چار سو والی ساڑھی پہنی تھی جو اس نے پچھلے ہی ہفتے خرید دی تھی۔ گلے میں قیمتی ہار، منگل سوتر کانوں میں ٹاپس، کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں، گھڑی، ناک میں کیل، اس کے بالوں کا جُوڑا بہت پُرکشش لگ رہا تھا ——— وہ تھوڑی دیر تک بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔

بیوی شرما گئی۔ اس نے ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے مسکرا کر کہا —— "کیا ارادہ ہے؟"

"کچھ نہیں ——" وہ ہڑبڑا گیا، پھر سنبھل کر پوچھا "کب تک لوٹو گے تم لوگ؟"

"برتھ ڈے کی تو پارٹی ہے۔ جلد ہی آجائیں گے۔"

"کھانا بھی تو ہے۔"

"ہاں ہے۔ مگر ہم لوگ کھانا کھاتے ہی چلے آئیں گے۔ رُکیں گے نہیں میں نے کُسم سے کہا تھا۔ بچوں ہی کو لے جاؤ۔ میرا کام کیا ہے۔ مگر اس نے ناراض ہونے کی دھمکی دی تھی۔ وہ تو آپ کو بھی ساتھ لانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ طبیعت خراب ہے۔ وہ نہیں آئیں گے۔"

اتنے میں نیچے سے پپّو کی آواز آئی۔

"ممّی! چلونا۔ کیا کر رہی ہو کب سے؟"

"اچھا جاؤ —— دیکھو بچے انتظار کر رہے ہیں۔"

بیوی چلی گئی، دروازہ ایک ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ خود بخود بند ہو گیا جانے وہ کتنی دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا دوسری کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس خاموشی سے اسے وحشت ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا پھر شیشے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک اپنے ہی عکس کو گھورتا رہا۔ پھُولے گال، چھوٹی آنکھیں بڑھا ہوا پیٹ، سر کے بال نصف سے زیادہ اُڑ چکے تھے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے تیزی سے اُڑتے ہوئے بالوں پر تشویش کا اظہار کیا تو بیوی نے کہا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے آدمی گنجا ہونے لگتا ہے تو اس کی ہتھیلی میں دولت کی لکیریں زیادہ گہری ہونے لگتی ہیں۔ چوڑی پیشانی۔ دولت کی نشانی۔"

اس وقت وہ مسکرا کر چپ ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ سوچنے لگا۔ بیوی کا وہ جملہ کتنا خود غرضانہ تھا۔ اسے اپنے بال بے حد عزیز تھے۔ وہ دس دس پندرہ پندرہ منٹ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال درست کیا کرتا تھا اور اس کی بیوی کے نزدیک گویا اس کے بالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ بس ہتھیلی میں دولت کی لکیریں گہری ہوتی جائیں۔ دولت، دولت، دولت، کیا ملا اسے اتنی دولت کما کر؟ یہی نا کہ اس کے بچّے کانونٹ میں پڑھنے لگ گئے۔ فرج کا ٹھنڈا پانی پینے اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانا سیکھ گئے۔ بیوی قیمتی ساڑیاں اور زیورات پہن کر اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کو مرعوب کرنے کا ہنر جان گئی ماں کاشی یاترا کے لیے روانہ ہو گئی مگر اسے کیا ملا؟ گنجا پن۔ بے خوابی۔ گھبراہٹ۔ بلڈ پریشر اور کبھی کبھی دل کو مسوس دینے والی اُداسی؛ اسے پانچ سال پہلے جنتا چال کی اپنی چھوٹی سی کھولی یاد آ گئی۔ جس میں سیلن کی وجہ سے عجیب سی بدبو پھیل گئی تھی۔ دیواروں میں لونا لگا تھا اور برسات کے موسم میں چھت کثیر البول مریض کی طرح قطرہ قطرہ ٹپکتی رہتی تھی راتوں میں مچھر جتھّوں کی شکل میں یلغار کرتے اور بے شمار کھٹمل ان کا خون چوستے رہتے۔ اس سب کے باوجود وہاں کبھی اسے بے خوابی کی شکایت نہیں ہوئی تھی نہ اس پر گھبراہٹ کے دورے پڑتے تھے، نہ اس کا بلڈ پریشر ہائی ہوا تھا۔ ٹھیک ہے وہاں اسے فرج کا ٹھنڈا پانی نہیں ملتا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کی بجائے چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانا پڑتا تھا —— ڈنلپ کے نرم گدّوں کی بجائے گٹھلی دار گدڑیوں پر سونا تھا، مگر گہری نیند سوتا تھا۔ آج اس نے اپنے فلیٹ میں آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا کر لی تھی۔ مگر من کی شانتی گنوا بیٹھا تھا۔ اب وہ چار گھنٹوں کی نیند کے لیے بھی سلیپنگ پلس کا محتاج تھا۔ اس کے فرج میں مرغی انڈا، مٹن، مکھن سب بھرا رہتا تھا۔ مگر اسے صرف دہی اور چاول ہی کھانا پڑتا۔ ڈاکٹر کی ہدایت بھی یہی تھی۔ اس نے اپنے پھولے پیٹ پر ہاتھ پھرایا۔ اس کی پتلی پتلی ٹانگوں پر اب یہ پھولا پیٹ عجیب بدوضع لگ رہا تھا۔ اس نے دیوار پر لگی اپنی تصویر کی طرف دیکھا۔ آئینے میں کھڑی پرچھائیں اور اس

تصویر میں کتنا فرق ہے ــــ دس برس پہلے کتنا اسمارٹ تھا وہ۔

دس برس، دس صدیاں، دس ہزار صدیاں، سچ مچ اس نے دس برس میں کافی لمبی مسافت طے کر لی تھی۔ اتنی لمبی کہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھی ناممکن تھا۔

یہ آرام دہ فلیٹ، قیمتی فرنیچر، اعلیٰ قسم کی کراکری، نفیس کپڑے زیورات دس برس پہلے اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا ــــ تو کیا وہ ان ساری چیزوں کو کسی ندی میں بہا دے؟ کسی خیراتی ادارے کو خیرات کر دے، پھینک دے، جلا دے، کیا کرے؟ کیا کرے آخر؟ یہ ساری چیزیں جو، اب اس کی اور اس کی بیوی بچوں کی زندگی کا لازمی جز بن چکی تھیں۔ جن کے بغیر اب ان کے لیے زندگی کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ساری چیزیں یک بیک ضائع کر دینا کیا اب ممکن ہے؟

اٹالین گھڑی کا پنڈولم ہل رہا تھا۔

”نہیں، نہیں ــــ نہیں نہیں ــــ“

وہ خود کو بدل سکتا تھا۔ مگر اپنے سارے گھر والوں کو بدلنا کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا؟

کیا اس کی بیوی اور بچے دس سال پیچھے کی زندگی میں لوٹنے کو تیار ہو جائیں گے؟

ہرگز نہیں۔

اس کی بیوی تو اب نئے ماحول میں ایسے رچ بس گئی تھی جیسے اس نے غربت کے دن دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ میک اپ کرنا، شاپنگ پر جانا اور پارٹیوں میں شریک ہونا ایسے سیکھ گئی تھی جیسے یہ سب اس کے خاندان میں پشتہا پشت سے چلا آ رہا ہو۔ اس کی بے شمار سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اس نے کہیں شام کی انگلش کلاس بھی جوائن کر لی تھی۔ اور ضرورت پر ویل کم، گڈ بائی، گڈ مارننگ، ہاؤ آر یو اور فائن جیسے الفاظ روزمرہ کی گفتگو میں کثرت سے استعمال کرنے لگی تھی۔ اب اس کے گھر کے بھی لوگ ناشتے کو بریک فاسٹ اور دوپہر کے کھانے کو لنچ کہنے لگے تھے۔ پہلے اس کی دونوں لڑکیاں میونسپلٹی کے اسکول میں پڑھتی

تھیں۔ مگر اب دونوں نہ صرف کانونٹ میں پڑھنے لگی تھیں بلکہ کھو کھو یا آنکھ مچولی جیسے گنوار کھیلوں کی بجائے پاس کے جیم خانے میں جاکر بیڈمنٹن کھیلنا اور اسکیٹنگ کرنا بھی سیکھ گئی تھیں۔ لڑکا کامکس پڑھتا تھا اور ٹارزن، فینٹم اور سپرمین میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ ابھی اس کی ناک بہنا بند نہیں ہوئی تھی مگر بیوی نے اعلان کر دیا کہ وہ اسے پائلٹ بنائے گی۔ عرصہ ہوا اس کی بیوی نے زمین پر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ ماں کو اس کی اندرونی اور بیرونی سرگرمیوں کا زیادہ علم نہیں تھا۔ بس وہ آئے دن بھجن، کِرتن اور پوجا پاٹھ میں اپنا وقت گزار لیتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے بہو اور پوتے پوتیوں کو پھولتا، پھلتا دیکھ کر سمجھتی تھی کہ یہ ساری خوشی اطمینان اور سکون اسی کی اپاسنا اور پرارتھنا کا نتیجہ ہے۔ اس کی اَنتم اِچھا تھی کہ وہ ایک برس کاشی میں گزارے۔ ماں کی اِچّھا پوری کرنا بیٹے کا پرم کرتویہ ہے۔ اس نے اسے کاشی بھیجنے کا پربندھ کروا دیا اور اب پچھلے چار مہینے سے ماں کاشی میں تھی اور ایشور درشن سے آتم شانتی لابھ کر رہی تھی۔

بظاہر اس کے اردگرد سب کچھ بہت اطمینان بخش تھا۔ اطمینان بخش۔ پُرسکون اور مسرتوں سے پُر۔ مگر جانے کیوں، کبھی کبھی وہ بے حد اُداس ہو جاتا! ایک بے نام سی کسک اس کے سینے میں ٹیس مارتی اور یک بیک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا۔ اس وقت نہ اسے فِرج کا ٹھنڈا پانی اچھا لگتا نہ پنکھے کی ہوا سُہاتی۔ اس وقت اسے بیوی کا میک اپ زدہ چہرہ کسی بُھتنی کے چہرے سے مشابہ دکھائی دیتا۔ اور بچّوں کی کلکاریں سانپوں کی پھپھکاریں معلوم ہوتیں۔ پانڈے۔ سید اور نائر کی دوستی نے اسے اس اُداسی سے چھٹکارا پانے کا گُر بتا دیا تھا۔ اور اب وہ کم از کم اتنی شرابوں کے نام جاننے لگا تھا جتنی اس کی ہتھیلی کی لکیریں۔

"رَم ـــــ دشمنِ غم" اسے اپنے ایک شاعر دوست کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔

رَم ـــــ ہاں ـــــ اور اس نے جلدی سے کتابوں کی الماری کھولی اور کتابوں کے

پیچھے چھپا کر رکھی ہوئی رم کی بوتل نکال لی۔ گلاس لیا۔ رم ڈالنے کے بعد گلاس میں دو آئس کیوبس چھوڑے اور گلاس لے کر پھر کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ دو بڑی چُسکیوں نے ہی اس کی اُداسی کو اس طرح چھانٹ دیا جیسے بارش کی پہلی پھوار تالاب پر جمی کائی کو چھانٹ دیتی ہے۔

” ہم —— اس نے میز پر پڑی رامائن کی طرف دیکھا۔ مگر اب اس کے اندر کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ وہ اب نارد کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے مستعد تھا۔

کہاں ہے وہ سوال؟ اس نے تیسری چُسکی لی اور رامائن کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ نارد نے مسکرا کر پوچھا —— ’ بتا تو یہ لکرم کس کے لیے کرتا ہے؟‘‘

’ ہش —— ہش —— ش —— لکرم، یہ لکرم ہے؟ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ لکرم ہے؟ یعنی ایک اچھے معقول مکان کی خواہش کرنا، بچوں کو اچھی تعلیم دلانا، بیوی کو پہنانا اوڑھانا، ماں کی خواہش کا احترام کرنا، یعنی یہ سب لکرم ہے؟‘

نارد کا دوسرا سوال سانپ کی طرح پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

” کیا تیرے بیوی بچے تیرے کرموں کے ساجھی دار بنیں گے؟“

اور یک بیک اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر گیا اس نے دوبارہ رامائن کو بند کر کے ایک طرف کو سرکا دیا۔ اسے اب رامائن سے ڈر لگنے لگا۔ اس نے رامائن اس لیے پڑھنا شروع کیا تھا کہ من کو شانتی ملے۔ یہاں تو اس کا سارا سکون حرام ہو گیا تھا۔ اسے اب بیوی پر غصہ آنے لگا۔ اسی نے تو اسے مشورہ دیا تھا کہ گھر میں پڑے پڑے تمہارا من گھبراتا ہوگا۔ دھارمک پُستکیں پڑھو، من کو شانتی ملے گی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا معمولی سا بلڈ پریشر ہے۔ چار چھ روز کے آرام سے نارمل ہو جائے گا۔ اس نے بھی سوچا ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے ہی کی تو بات ہے۔ اس ایک ہفتے کو دھارمک ہفتہ سمجھ کر منا لیں گے۔ دارو، سگریٹ اور ماس تو خود ڈاکٹر منع کر چکا ہے۔ تھوڑا دھارمک پُستکوں کا ادھین کر لیں گے، دھرم پالن ہو جائے گا۔ اس نے شروع کے دو تین روز گیتا کا پاٹھ

کیا۔ مگر اس میں تو صرف بھگوان کرشن کے اُپدیش ہی تھے۔ اسے مزا نہیں آیا۔ پھر اس نے رامائن پڑھنا شروع کیا مگر شروع کے صفحات پر ہی والیا اور نارد کے واقعے نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ رامائن کو اس نے اپنے سے دور تو سرکا دیا۔ مگر جوں ہی اس پر نظر پڑتی اسے نارد کا سوال سُنائی دیتا ــــــ ”تو یہ سب ککرم کس لیے کرتا ہے؟“

اب وہ نارد کو کیسے سمجھائے کہ آج کے زمانے میں اپنی تنخواہ کے علاوہ اوپر سے ہزار پانچ سو کمانا کوئی ککرم نہیں ہے، بیوی کو چند زیورات بنا دینا بچّوں کو کانونٹ اسکول میں پڑھانا۔ گھر میں ٹی وی، فرج اور ڈائننگ ٹیبل کا رکھنا، پاپ نہیں آج کی ضرورت ہے۔ ماحول کا تقاضا ہے۔

جب تک یہ چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں، یہ تین کمروں کا فلیٹ اس کے تصرف میں نہیں تھا۔ وہ لوگوں کی نظروں میں کتنا حقیر تھا۔ دفتر کے ساتھی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنستے، سرگوشیاں کرتے اور اسے طنزاً ’ستیہ کام‘ کے نام سے مخاطب کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی ان پر اٹیٹس کے بھوت کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ اور اس کی بیوی گاؤں کی سیدھی سادی گھریلو عورت کے سوا کچھ نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس وقت تک شاپنگ جیسی لت میں مُبتلا ہوئی تھی۔

پانڈے اکثر اس سے کہتا ــــــ ”بیٹا! اپنی روش نہیں بدلو گے تو ایک دن اس دس بائی دس کی کھولی میں خون تھوکتے تھوکتے مرجاؤ گے اور بیوی بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے پھریں گے۔“

بظاہر وہ پانڈے اور دوسرے ساتھیوں کی ان چبھتی باتوں کو ہنس کر ٹال جاتا۔ مگر اندر بہت گہرے میں سے کچھ چٹختا سا محسوس ہوتا، دل ڈوبنے لگتا اور ایک لمحے کو اس کی نظروں کے سامنے اپنی بیوی اور بچّوں کی تصویر گھوم جاتی۔

اس کی جوان اور خوبصورت بیوی کسی بنگلے میں جھوٹے برتن مانجھ رہی ہے۔ اس کا بلاؤز جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے۔ ساڑی مسک گئی ہے اور بنگلے کے موٹے سیٹھ کی نظریں اس کے بدن کے عُریاں حصّوں پر گڑی جا رہی ہیں۔ اس کے بچے فٹ پاتھ پر بیٹھے بلک بلک کر

کر راہ گیروں سے ۵ پیسے دس پیسے مانگ رہے ہیں۔ ماں ——— ماں کی لاش کمرے کے سیلن زدہ فرش پر تختہ بنی پڑی ہے۔ اُف ——— اس کی پیشانی پر پسینہ چھلچھلا آتا اور اسے لگتا وہ اچانک اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ایک معمولی سی ٹھوکر پر بھی ریت کے گھروندے کی طرح بکھر جائے گا۔

اس وقت اس کے کانوں میں جیسے کوئی زور زور سے چیخنے لگتا۔

"اپنی روش بدلو، ورنہ خون تھوکتے تھوکتے مرجاؤ گے۔"

"اپنی روش بدلو، ورنہ خون تھوکتے تھوکتے مرجاؤ گے۔"

ساتھیوں کے زہر میں بجھے جملے، بیوی کی حسرت بھری فرمائشیں، بچوں کی تڑپ، ماں کی کھانسی ——— آخر ایک دن وہ اپنی روش بدلنے پر مجبور ہو گیا مگر یہ تبدیلی اس کے اندر بہت دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے آئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتا گیا تھا۔ اب دفتر میں اس پر کوئی 'ستیہ کام' کی تہمت نہیں لگاتا اور نہ اسے دیکھ دیکھ کر اس کے ساتھی سرگوشیاں کرنے اور مسکرانے لگتے۔ اب وہ ان سب کا ہم راز تھا اور وہ سب اس کے شریک کار۔

گھر میں بیوی کا مرجھایا چہرہ کنول کی طرح کھلنے لگا۔ بچوں کی چہکار میں اضافہ ہو گیا۔ ماں کی کھانسی کم ہوتے ہوتے بند ہو گئی ——— سب خوش تھے اور سب کو خوش دیکھ کر وہ بھی خوش تھا کہ ان سب کی خوشی کی خاطر تو اس نے یہ زہر پیا تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تبھی سے اسے ٹوٹی پھوٹی کویتائیں لکھنے کا شوق تھا۔ اور اس کا یہ شوق جنتا جالی کی کھولی تک برقرار تھا۔ مگر اب دھیرے دھیرے اس کے پُرانے شوق بدلتے گئے اور ان کی جگہ نئے نئے شوق جنم لینے لگے۔ اب کویتاؤں کے بدلے اسے بے شمار پارٹی جوکس یاد تھے، جنھیں مختلف پارٹیوں میں سُنا کر وہ لوگوں کو ہنسا ہنسا کر رلا دیتا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس کے اندر وہ دَم توڑتا کوئی ایک آدھ ہچکی لیتا تو وہ یک بیک تڑپ اُٹھتا۔ اور آج والیا کی کتھا نے تو اسے بے حد مضطرب کر دیا تھا۔

اس نے رم کا تیسرا پیگ بنایا۔

سچ! وہ کیوں بیوی بچّوں کے لیے اپنے آپ کو گناہ گار کرے؟ انھیں پالنے کی ذمّہ داری ضرور اس کی ہے۔ اور وہ انھیں اپنے ضمیر کو آلودہ کیے بغیر بھی پال سکتا ہے۔ آخر روپیہ بٹورنے، بے ایمانیاں کرنے اور دوسروں کا گلا کاٹنے سے پہلے بھی تو انھیں وہ پالتا تھا۔ پھر وہ کیوں اس دلدل میں اُتر گیا وہ کیسی ہوس تھی جس نے اس کی شخصیت کا رُخ ہی بدل دیا۔ یقیناً اس نے یہ سب ایک بہتر زندگی کے حصول کے خاطر کیا تھا۔ مگر اس زندگی کا رس تو اس کے بیوی بچّوں کو طراوت بخش رہا تھا۔ اس کے حصّے میں تو زہر ہی زہر آیا تھا۔

وہ تیسرا پیگ بھی خالی کر گیا اور انتہائی تلخی سے مونہہ بنا کر خالی گلاس کو گھورنے لگا۔ تھوڑی دیر تک خالی گلاس کو گھورتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے بوتل اٹھائی اور چوتھا پیگ انڈیلنے لگا۔

"بس —— کل وہ بیوی سے صاف کہہ دے گا کہ اب وہ مزید بار اُٹھانے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ورنہ اس کے کاندھے ٹوٹ جائیں گے وہ لوٹ رہا ہے۔ وہ دس برس پیچھے لوٹ رہا ہے۔ آگے بڑھتے وقت بیوی ہمیشہ اس کی پیٹھ ٹھونکتی رہی تھی۔ اب پیچھے لوٹنے میں بھی اس کا ساتھ دے مگر کیا وہ مان جائے گی؟ ماننا ہی پڑے گا۔ بہت ہو گیا آدمی سونے کا نوالہ کھائے مگر من کی شانتی نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ بس کل سے یہ سب شراب، سگرٹ سب بند —— کل ہی وہ کباڑیے کو بُلا کر یہ ڈائننگ ٹیبل، صوفہ سیٹ، شوکیس، سارا غیر ضروری سامان بیچ دے گا۔ دھیرے دھیرے ٹی وی اور فرج سے بھی چھٹکارا پالے گا۔ بیوی لاکھ سر پیٹے، بچّے ہزار ضد کریں اب وہ کسی کی نہیں سُنے گا۔ اب وہ صرف وہی کریگا جو اس کا ضمیر کہتا ہے۔ لوگ یقیناً اسے پاگل کہیں گے، بلا سے —— دفتر میں بھی سب اسے عجیب عجیب ناموں سے پُکاریں گے۔ پکاریں —— اب وہ ان سب کی فکر کرے

کہ اپنے دل کی آواز سُنے۔ اسے ہر قیمت پر اپنے من کی شانتی عزیز ہے۔

چوتھا پیگ بھی ختم ہو گیا۔ اب وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا جھوم رہا تھا —— دیواریں، کھڑکیاں، کمرہ، کمرے کی ہر چیز، اس کے گرد رقص کر رہی تھی۔ اور وہ اپنی گردن کبھی ادھر کبھی اُدھر گھماتا لہک لہک کر انھیں رقص کرتا دیکھ رہا تھا۔

میز پر رکھی بوتل بھی آہستہ آہستہ تھرکنے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بوتل کی گردن دبوچ لی۔ گلاس میں شراب انڈیلی۔ گلاس کو آنکھوں کے برابر لا کر پیگ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ مگر اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ایک پر ایک دو دو تین تین گلاس چڑھے ہوئے تھے۔ اس نے تھک ہار کر گلاس کو پھر میز پر رکھ دیا۔ اور جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنا چاہا —— جگ خالی تھا۔ اس نے جھنجھلا کر جگ دوبارہ میز پر ٹپکا —— اور گلاس اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ نیٹ رم ایک جلتے تیر کی طرح حلق کو چھیلتی ہوئی معدے کے اندر اُتر گئی۔ اس نے بہت بُرا سا منہ بنایا۔ گلاس کو میز پر پٹخ کر کھڑا ہو گیا —— مگر پیر بُری طرح لڑکھڑا گئے۔ ڈگمگا کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کمرہ اور کمرے کی چیزوں کا رقص بہت تیز ہو گیا تھا۔ اور ساری چیزیں ایک خاص لے میں پوچھ رہی تھیں۔

"تو یہ ککرم کس کے لیے کرتا ہے؟"

"تو یہ ککرم کس کے لیے کرتا ہے؟"

اسے غصہ آ گیا۔ وہ پھر لڑکھڑاتا ہوا کرسی سے اُٹھا۔ اس نے اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے جیسے حرکت کرتے کمرے اور رقص کرتی چیزوں کو تھام کر اپنی اپنی جگہ کھڑا کر دینا چاہتا ہو۔ ہر چیز اس کے پاس سے کترا کر نکل رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر چیزوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ مگر کوئی چیز اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر وہ تھک گیا۔ تھک کر ہانپنے لگا۔ چیزوں کا رقص جاری تھا۔ اچانک کمرے کی دیواریں اپنی جگہ سے سرک سرک کر اسے دبوچ لینے کو بڑھیں۔ چھت بیٹھنے لگی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ یکے بعد دیگرے کمرے کی اشیا اس پر ڈھیر ہوتی چلی گئیں اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اس کے بعد اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

عابد سُہیل

سوا نیزہ پر سُورج

(لکھنؤ کے نام دُوسری کہانی)

میری بڑی بیٹی سامنے کھڑی مُسکرا رہی تھی۔

مَیں نے پُوچھا "کھیل چکیں"۔

"کیا کھیلیں"۔ اس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں جُھلا دئے۔

"کیرم کیوں نہیں کھیلتیں"۔

"آپ تھوڑی دیر بعد کہیں گے تم لوگ شور کرتے ہو ـــــ اور پھر شگوفہ کھیلنے بھی تو نہیں دیتی ـــــ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سب گوٹیں گڑبڑ کر دیتی ہے۔ خود تو کھیلنا آتا نہیں ہمیں بھی نہیں کھیلنے دیتی۔

"بچّی ہے" مَیں نے کہا "اپنی چھوٹی بہن کا خیال تو کرنا ہی چاہیئے"۔ مَیں نے اپنے حساب سے سارا جھگڑا چُکا دیا۔

"تو ہم کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ہم بھی تو بچّے ہیں"۔ فوزیہ نے بے حد سادگی اور بھولے پن سے کہا۔

مَیں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی ابھی تو وہ بھی بچّی ہی تھی۔ اس سے یہ امید کرنا کہ چھوٹے بھائی بہنوں کے جھگڑے چکائے چھوٹی بہن کیرم کی گوٹوں کو کھیل کے درمیان بار بار بگاڑ دے تو

غصّہ ہونے کے بجائے انھیں پھر سے اپنی جگہ رکھ کر اسے سمجھائے اس کے ساتھ ذرا زیادتی ہی تھی اس لیے میں نے کہا۔

"تو تم دونوں لوڈو کیوں نہیں کھیلتے۔"

"صبح تو کھیلا تھا۔"

"تو اور کھیلو۔"

"اور کیا کھیلیں!" وہ منمنائی۔ "صبح جب سیف ہارنے لگے تو خفا ہو کر الگ بیٹھ گئے۔ بولے آپ ہمیشہ ہرا دیتی ہیں ضرور بے ایمانی کرتی ہیں۔"

"تو ایسا کرو" میں نے ایک ترکیب نکالی "خود تو چار گوٹوں سے کھیلو اور اس کو دو گوٹوں سے کھیلنے دو۔"

"اس سے کیا ہوگا" فوزیہ نے پوچھا۔

"ہوگا یہ کہ تم اچھا کھیلتی ہو۔ تم تو جیتو گی ہی۔ اس طرح ممکن ہے سیف بھی کبھی جیت جائے۔ اس کی بھی خوشی ہو جائے گی۔"

"اس میں اچھا کھیلنے کی کون سی بات ہے۔" اس نے کہا "یہ تو قسمت کی بات ہے۔ پانسہ میں جو بھی نمبر آجائے۔ بڑے چھوٹے سے اس کا کیا تعلق۔"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا ابو ـــــــ وہ پانسہ ڈالیں تو گن کر ان کی گوٹ بھی آگے بڑھاؤ اس کا بھی خیال رکھو کہ ان کی گوٹ نہ پٹنے پائے۔ اس پر بھی ہار جائیں تو منھ پھُلا کر بیٹھ جائیں۔"

سچ پوچھئے تو فوزیہ کی دلیل میں وزن تھا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ اتنے میں سیف میاں دوسرے کمرے سے آگئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو مجھے دیکھتے ہی بہہ نکلے۔

"ابو دیکھئے گڑیا ہمارے ساتھ کھیلتیں نہیں۔" یہ کہہ کر سیف جو ہمیشہ فوزیہ کو گڑیا ہی کہتے تھے بھوں بھوں رونے لگے۔

فوزیہ نے جب دلیل کو آنسوؤں سے ہارتے دیکھا تو وہ بھی رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد تینوں بھائی بہن پھر ایک جگہ مل جل کر کھیلنے لگے۔ کھڑکی سے جھانک کر میں نے دیکھا تو آنگن کے دوسری طرف باورچی خانہ کے پاس والے دالان میں ان کھلونوں کی جو امتحانات ختم ہونے کے بعد دوبارہ ان کے قبضہ میں گئے تھے بارات سجی تھی۔ چھوٹی چھوٹی اینٹوں کو جوڑ کر چولہا بنایا گیا تھا جس پر ایک چھوٹی سی پتیلی میں کھانا پک رہا تھا۔ سامنے گڈے گڑیوں کا صوفہ سیٹ سجا تھا۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ صوفوں پر آمنے سامنے گڈے گڑیا بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ٹین کی پھولدار رنگین پلیٹیں رکھی تھیں جن میں بسکٹ اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھے تھے۔ ٹین کی رنگین کیتلی اور چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں طشتریاں قرینے سے میز پر سجی تھیں۔ فوزیہ نے پتیلی پر سے طشتری اٹھا کر چمچے سے ایک آلو نکالا اور اسے دو انگلیوں سے دبا کر دیکھا اور بولی "ابھی کچے ہیں" تو شگوفہ نے گڑیا گڈے کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی کھانے میں تھوڑی دیر ہے۔ آپ لوگ جب تک ناشتہ کیجیے۔"

میں اپنی ہنسی بمشکل ہی ضبط کر سکا۔ وہ اپنے کھیل میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں ورنہ فوزیہ وہیں سے کہتی "ابو اللہ آپ اندر جائیے۔ دیکھئے ہم تو آپ کا کھیل نہیں دیکھتے ہیں۔"

میں مطمئن ہو کر کمرہ میں چلا آیا۔ بیوی عزیزہ کے یہاں جو یکایک شدید بیمار ہو گئی تھیں گئی ہوئی تھیں۔ اس گھر میں دو بچوں کے خسرہ نکلی تھی اس لیے تینوں کو گھر پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ ان عزیزہ کا گھر کافی فاصلہ پر تھا۔ آنے جانے میں تین چار گھنٹے تو لگیں گے ہی —— میرے لیے تینوں بچوں کی اتنی دیر تک دیکھ بھال کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس لیے شروع میں تو گھبرایا تھا کچھ الجھا بھی تھا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ میری پریشانی بلا سبب تھی۔ ویسے بھی اب بیوی کو گئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے اور اب وہ واپس آتی ہی ہوں گی۔

یہ سوچ کر میں نے پلنگ پر دراز ہو کر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں بمشکل دو تین خبریں ہی پڑھ سکا تھا کہ سیف میاں روتے ہوئے آئے

"ابو گڑیا آپا بڑی خراب ہیں۔ اپنی گڑیا کو تو دو دو پیالی چائے پلائی ہیں اور میں نے کہا کہ ہمارے گڈّے کو بھی ایک پیالی اور ــــــ تو بولیں جانتے ہو شکر کتنی مہنگی ہے۔ آپ تو کل کہہ رہے تھے کہ شکر سستی ہو گئی ہے۔

میں ہنس پڑی مشکل سے روک سکا۔ پھر میں نے فوزیہ کو آواز دی۔

"فوزیہ"

"جی ابو"

"سنو"

"آئی" کہتی ہوئی وہ آ براجی۔

"کیوں جی تم سیف کے گڈّے کے لیے چائے کی دوسری پیالی کیوں نہیں بنا دیتیں"

"ابو آپ جانتے ہیں۔ یہ بڑے حضرت ہیں۔ پہلے بولے ہمارا گڈّا بسکٹ اور ککڑی زیادہ کھائے گا۔ اسے بھوک لگی ہے۔ تم اپنی گڈیا کو دو پیالی چائے پلا دینا۔ میں نے بسکٹ اور ککڑی کا ایک ایک ٹکڑا اپنی گڑیا کو دیا اور باقی سب ان کے گڈّے کو دے دیا۔ اب چائے بھی دوسری پیالی مانگ رہے ہیں۔

"لیکن گڈّے گڑیا تو کچھ کھائے نہیں۔ (وہ بسکٹ اور ککڑی ہوئے کیا" میں نے پوچھا۔

"ہوئے کیا ــــــ خود کھا گئے" فوزیہ بولی۔

"اور تم نے نہیں دوسری پیالی چائے پی لی۔ اور بسکٹ اور ککڑی بھی تو کھائی تھی تم نے ــــــ"

سیف روہانسے ہو گئے۔

اسی لمحہ شگوفہ ایک ہاتھ میں کھلونے والی طشتری پیالی اور دوسرے میں بسکٹ اور ککڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لیے کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی کہ اگر ذرا بھی تیزی سے چلی تو پیالی سے چائے چھلک جائے گی۔

”ابّو یہ آپ کا حصّہ ہے“۔ اس نے کہا اور دھیرے سے پیالی اور طشتری تخت پر رکھ کر چھوٹے سے ن کے چمچہ سے پیالی میں جو بالکل خالی تھی شکر چلانے لگی۔

”بھئی اس میں چائے تو ہے ہی نہیں“ مَیں نے کہا۔

”جھوٹ موٹ“ کہہ کر اس نے پیالی میرے مُنھ سے لگا دی۔

”بڑے مزے کی ہے“۔ مَیں نے کہا تو فوزیہ بھی مُسکرا دی لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر اس نے مُنھ دوسری طرف کر لیا۔ سیف اب بھی رو ہانسے تھے۔

اصل میں یہ لوگ صبح سے کھیلتے کھیلتے تھک چکے تھے۔ آخر کھیلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹّیاں شروع ہوئے پندرہ بیس دن ہو چکے تھے۔ شروع میں تو ان لوگوں نے چھٹّیوں کے خوب مزے لیے۔ رنگ برنگی تصویروں کی ہندی اُردو اور انگریزی کی جو بہت سی کتابیں مَیں نے منگا کر رکھی تھیں انھیں دو نہیں چار چار بار پڑھ ڈالا۔ پھر کئی دن بغیر لڑے جھگڑے کھیلتے رہے۔ اب کئی دن سے ہر روز پُوچھا جا رہا تھا اسکول کھُلنے میں کتنے دن باقی ہیں اور ہر کھیل کا خاتمہ بھی لڑائی پر ہونے لگا تھا۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ ملحقہ مکان کی بچّی نازو بہت دنوں سے نظر نہیں آئی اور یہ لوگ بھی اس کے یہاں نہیں گئے۔ مَیں نے کہا۔

”اب تم لوگ نازو کے ساتھ نہیں کھیلتے“۔

”جب سے جھگڑا ہوا ہے ان کی دادی آنے ہی نہیں دیتیں ہمارے یہاں“ فوزیہ نے کہا۔

”تو تم لوگ چلے جایا کرو“۔

”امّی نے منع کر دیا ہے“۔

خالی چرخی ہاتھ میں تھی اور پتنگ آسمان پر —— میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو مَیں نے کہا ”اچھا اب تم لوگ سو جاؤ۔

”امّی کب آئیں گی۔ شگوفہ نے پُوچھا۔

”اب آتی ہی ہوں گی“۔ مَیں نے تسلّی دی۔

”جب امی آجائیں گی تب سوئیں گے مزے سے۔“

”نہیں“ میں نے ”نہیں کی“ ”ی“ کو ذرا کھینچ کر مصنوعی غصہ سے کہا ”بس اب لیٹ جاؤ۔ لُو چلنے لگی ہے۔ اب دالان میں کوئی نہیں کھیلے گا۔“

میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر تینوں بچے لیٹ گئے۔ فوزیہ اور سیف تخت پر اور شگوفہ میرے پاس مسہری پر۔

”آنکھیں بند“ میں نے کہا تینوں بچوں نے آنکھیں بند کر لیں اور میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کھُسر پھُسر کی آواز سُن کر میں نے اخبار آنکھوں کے سامنے سے ہٹایا تو فوزیہ اور سیف شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”سو جاؤ ——“ میں نے ذرا سختی سے کہا۔

دونوں نے خوب کَس کے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن شریر مسکراہٹ ان کے چہروں پر اب بھی کھیل رہی تھی۔ میں پھر اخبار پڑھنے لگا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھُلی تو تخت خالی تھا۔ مسہری پر شگوفہ بھی نہ تھی۔ میں کچھ دیر تک اسی طرح بستر پر لیٹا رہا۔ شاید اس انتظار میں کہ کسی کی آواز سُنائی دے تو بُلاؤں۔ لیکن نہ کسی بچے کی آواز سُنائی دی نہ یہ اندازہ ہی ہوا کہ وہ کہاں ہیں۔

میں دھیرے دھیرے بستر سے اُٹھا۔ سامنے والا دالان خالی پڑا تھا۔ اگرچہ کھلونے صوفہ سیٹ سب اسی طرح سجے تھے۔ اب مجھے تشویش ہوئی لیکن صدر دروازہ اندر سے بند دیکھ کر میری تشویش کچھ کم ہو گئی۔ دوسرے کمرہ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دراز سے جھانکا تینوں بچے کمرہ میں موجود تھے۔

شگوفہ فرش پر دراز تھی۔ اس کا کُرتا اُوپر تک اٹھا تھا اور پیٹ پر پٹی بندھی تھی۔ جس میں سے خُون کی چھینٹیں جھانک رہی تھیں۔ لیکن پاس والی میز پر لال روشنائی کی دوات اُلٹی پڑی اور سارا میز پوش رنگ سے تر بتر دیکھ کر میری گھبراہٹ دُور ہو گئی لیکن معاملہ کیا ہے میری سمجھ میں نہ آیا۔ شگوفہ کے پاس ہی ترکاری کاٹنے والی چُھری ایک پھٹے سے کپڑے پر رکھی ہوئی تھی۔ کپڑا جگہ جگہ سے سُرخ

ہو گیا تھا۔ سیف لکڑی کی ایک کھپنچی جس کے ایک سرے پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔ اور فوزیہ سے کہہ رہا تھا۔

”مٹی کا تیل تو اسٹوو میں ہے اور اسٹوو جل ہی نہیں رہا ہے۔“

”وہیں ہو گا ـــــ کچن میں الماری کے نیچے دیکھو۔“

”اچھا“ کہہ کر سیف نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر مُسکرایا اور پھر فوراً ہی کمرہ میں لوٹ گیا۔ مَیں بھی کمرہ میں داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر شگوفہ فرش پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ مَیں نے پُوچھا۔

فوزیہ نے میری طرف دیکھا اور پلک جھپکائے بغیر بولی۔

”ہم لوگ شیعہ سُنّی لڑائی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔“

ذکیہ مشہدی

چرایا ہوا سکھ

ہمیشہ کی طرح آج بھی اجیت نے سونے سے پہلے کافی کا پیالہ ختم کیا، پھر دو تین سگریٹ پھونکے لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے امیتا کے گرد بازوؤں کا حلقہ نہیں بنایا۔ بہت دیر تک وہ چھت کی طرف یونہی بے مقصد دیکھتا رہا۔ انتظار کرتے کرتے جب امیتا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ خود ہی قریب آ گئی اور اجیت کی چوڑی چھاتی پر بالوں کا آبشار بکھر گیا۔ اجیت کو نتھنوں میں چبھن کا احساس ہوا۔ خوں خوں کرتے ہوئے اس نے بال پیچھے ہٹائے مگر امیتا کسی ضدی بچے کی طرح اس سے چمٹی رہی۔

"اجیت ڈارلنگ، جب تک میں تمہارے بہت قریب نہ آ جاؤں مجھے نیند نہیں آتی۔"

"یہ بال تو پیچھے کرو۔ ناک میں گھسے آتے ہیں۔" اجیت کچھ جھنجلا کر بولا۔ "آخر تم بال باندھ کر کیوں نہیں سوتی ہو؟"

اسے مسز کھنہ کے بغیر مانگ کے اونچے بنے ہوئے بالوں کی کس کر گوندھی ہوئی چوٹی یاد آ گئی۔ ایک دن جب وہ گئی رات ان کے یہاں ٹسٹ میچ کا اسکور پوچھنے گیا تھا تو مسز کھنہ سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اونچے بالوں اور سخت گوندھی ہوئی چوٹی میں ان کا بیضوی چہرہ اور تیکھے نقوش زیادہ واضح ہو اُٹھے تھے۔

بڑی چور سی مسکراہٹ اجیت کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

امیتا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آج یہ نئی بات کیا۔ اجیت ہی تو کہتا تھا کہ اسے امیتا کے گھنے

بال کھلے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں تھا۔ وہ رات کو اپنا سَر اس کی چوڑی چھاتی پر ٹکاتی تو اجیت کی اُنگلیاں دیر تک اس کے بالوں میں اُلجھی رہتیں۔

"تمھیں نے تو کہا تھا" وہ دھیرے سے بولی "کہ رات کو بال کُھلے رکھا کرو۔"

"مَیں نے؟ میں نے کب کہا تھا؟" اجیت صاف مُکر گیا۔

"تمھاری طبیعت کچھ خراب ہے کیا؟ متفکر ہو؟" امیتا نے ہولے سے سر اس کے سینے سے ہٹا لیا۔ بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے پہلے اجیت کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر نرم نرم ہونٹ ٹکا دیئے۔ اجیت کی جھنجلاہٹ غصّے میں تبدیل ہونے لگی مگر وہ خاموش رہا۔ یہ عورت کی ذات اگر شک میں مبتلا ہو جائے تو اس کی سانسوں تک میں زہر گُھل جائے گا۔ کالے ناگ کی طرح فوں فوں کرتی، زہر اُگلتی ناچتی پھرے گی۔ کب کس کو ڈس لے۔

امیتا کی انگلیاں اس کے بالوں میں گھوم رہی تھیں۔ لانبی لانبی نرم انگلیاں۔ اسے میٹھی سی خنکی کا احساس ہوا۔ نیند دھیرے دھیرے اس پر غلبہ پا رہی تھی۔ کبھی آنکھیں کُھلتیں، کبھی بند ہوتیں، نیند کی آتی جاتی ترنگوں پر مسز کھنہ کا چہرہ کبھی اوپر آتا کبھی نیچے جاتا۔ امیتا کیسی اچھی ہے، موڈ پہچانتی ہے۔ اجیت کو متفکر دیکھا تو خاموشی سے ہٹ گئی۔ ہوگا کوئی آفس کا مسئلہ۔ زیادہ سے زیادہ اس نے یہی سوچا ہوگا۔ اجیت کے دل میں سویا ہوا پیار پل کے پل جاگا — جب سے اس کے مکان کے اوپر والے حصّے میں مسز کھنہ آن کر رہی تھیں، یہی ہو رہا تھا۔ امیتا کے لیے کبھی اس کا دل جھنجلاہٹ سے بھر اُٹھتا، کبھی غصّے سے اور کبھی پیار سے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ان احساسات کو کس خانے میں رکھے۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے خوبصورت دو منزلہ مکان کی اوپری منزل سے اس موٹے اَن کلچرڈ کرایہ دار کو ہٹا پایا تھا۔ سارے ڈرائنگ روم میں کیلیں ٹھونک کر لال پیلے کلنڈر لٹکا رکھے تھے۔ اوپر سے کبھی کدو کے چھلکوں کی بارش ہوتی، کبھی شریفے کے بیجوں کی، کبھی "صرف" راکھ کی۔ بدتمیز بچّے لان پر کھلے ہوئے گلاب توڑ لے جاتے۔ نوکر سلیقے سے تراشی ہوئی گھاس پر ان کے دو مہینے کے ننھے سے بچّے کے پوتڑے پھیلا جاتا۔ "اوپر دھوپ نہیں آتی جی" وہ دانت نکوس کر کہتا۔ سیٹھ کی بیوی امیتا کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئی چیز

نہیں کھاتی تھی۔ تم مانس مچھی کھاتی ہو، ہم ٹھہرے ساتوک بھوجن والے۔ وہ ناک چڑھا کر کہتی اور اجیت غصّے سے لال پیلا ہو جاتا۔ بڑی مشکلوں سے جان چھوٹی۔ سرن کے توسط سے نئے کرائے دار آئے تو اجیت کو لگا کرائے دار نہیں آئے۔ ڈرائنگ روم کے لیے ڈیکوریشن پیس خریدا گیا۔ کھنہ صاحب تو اسمارٹ تھے ہی، ان کی بیوی کا بھی جواب نہ تھا۔ واہ، واہ، واہ! گوری بھی بہت عورتیں ہوتی ہیں، لانبی بھی بہت سی ہوتی ہیں، تیکھی سی، چھوٹی سی ناک بھی بہت سی عورتوں کی ہوتی ہے مگر ان تمام چیزوں کا صحیح مقدار میں امتزاج اور اس امتزاج کا صحیح استعمال شاید سب میں نہیں ہوتا۔ جیسے قورمے کی بُنیادی ترکیب تو ایک ہی ہوتی ہے، کچھ مرچیں، کچھ گرم مسالہ، کچھ دہی، کچھ پیاز، نرم ملائم گوشت۔ لیکن ان کا صحیح امتزاج کچھ ہی لوگوں کو آتا ہے۔ ورنہ ہر باورچی کے پکائے ہوئے سالن کے ذائقے میں فرق کیوں ہو جاتا ہے؟ اجیت کا جی چاہتا ذرا اس ہانڈی کو بھی سونگھ کر دیکھے۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات۔ بس آج کل اجیت کے ذہن میں یہ مصرعہ یوں ہی گونجتا رہتا تھا جیسے کسی پرانے ریکارڈ پر سوئی آکر اٹک جائے۔ بلائے جان ہے غالب، بلائے جان ہے غالب۔ نیند سے بوجھل آواز میں وہ غیر شعوری طور پر پھر یہی گنگنانے لگا۔ وحشت تیری کی ـــــ امیتا سوچے گی کہ ابھی تو جھنجلا رہے تھے، اب غالب کا شعر پڑھنے لگے۔ پھر کان کھانا شروع کر دے گی۔ ہے بھگوان تو نے عورت کیوں بنائی۔ اس نے آنکھوں کے کونوں سے چور انداز میں جھانک کر دیکھا۔ امیتا تقریباً سو چکی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا۔ اچھا ہے سو گئی۔ اب کم از کم جاگتی آنکھوں کے خوابوں پر پہرہ تو نہیں بٹھائے گی۔

مسز کھنہ کی ناک میں پڑی ہوئی ہیرے کی جگر جگر کرتی لونگ پھر اندھیرے میں کوندنے لگی۔ اجیت آج کل کچھ زیادہ ہی کنفیوزڈ ہو رہا تھا۔ کل کی بات ـــــ امیتا نے کہا تھا:

"اجیت ڈارلنگ! ذرا مسز کھنہ سے ان کا کافی پرکولیٹر تو مانگ لاؤ، میں نہانے جا رہی ہوں"۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹرے پر نہ جانے کیا کیا ڈھیر تھا، کریم کی شیشیاں، شیمپو، نیل فائل، کلینزنگ ملک، ابلتے ہوئے پانی کا جگ ... ...

تو امیتا تفصیل سے نہانے جا رہی ہے ـــــ ایک گھنٹے کی چھُٹی ـــــ مارے خوشی کے

اجیت نے اس کے گال پر چٹکی بھری اور ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا۔ دیوان پر دراز مسز کھنہ فلم فیر کی ورق گردانی کر رہی تھیں اور اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم کا ایک حصہ ہی معلوم ہو رہی تھیں۔

"ہائی ——" انھوں نے اپنے موتی جیسے دانت چمکا کر کہا۔

"مسز کھنہ وہ بات یہ ہے کہ امیتا کو ... ..."

انھوں نے بات کاٹ دی۔ "دیکھیے ہم لوگوں کو ایک دوسرے کو جانتے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں اور آپ ابھی تک اس قدر تکلف برتتے ہیں۔ میرا نام شیلا ہے۔"

"بات یہ ہے ... ..." اجیت ان کا نام لیتے ہوئے ہکلا گیا۔

"بات وات کچھ نہیں۔ شیلا کہیے تب ہی سنوں گی۔"

"اچھا تو شیلا جی۔" اجیت کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس اُبلتے احساس کو کیا نام دے۔ خون کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا —— "شیلا جی! میں اس لیے آیا تھا کہ امیتا کو آپ کا کافی پرکولیٹر چاہیے!"

"ضرور —— وہ تو میں دے ہی دوں گی مگر آپ پہلے یہاں ہی جو کافی پی لیں —— ؟" اور انھوں نے نوکر کو آواز دی۔

اجیت سنبھل کر بیٹھ گیا پھر گپیں چلیں تو چلیں۔ ساتھ بیٹھنے کے مواقع تو بہت آتے تھے مگر ایک طرف تو کھنہ جی ہوتے تھے دوسری طرف امیتا۔ یہ موقع شاید اپنی نوعیت کا دوسرا ہی تھا۔ تنہائی کا دوسرا موقع آیا تھا تو تکلف کی دیوار خاصی موٹی تھی۔ اس مرتبہ اس میں رخنے پڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید اگلی بار ایسا موقع آئے تو کچھ اور رخنے پڑیں اور پھر شائد بیٹھ ہی جائے۔ ہوں —— بلّی کے خواب میں چھیچھڑے —— چھی چھی —— میں یہ کیا سوچ رہا ہوں۔ امیتا جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے —— اجیت نے اپنے اوپر لعنت بھیجنی چاہی تھی کہ ان کا نوکر کافی لے کر آ گیا۔ بھلا مسز کھنہ کو خود اُٹھ کر پیالہ بڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ قریب آ کر جھکیں تو ان کے گہرے کٹے ہوئے بلاؤز کا گریبان کچھ اور نیچا ہو گیا اور بڑی مدھم بڑی پیاری سی خوشبو اجیت کی ناک سے ٹکرا کر اس کے حواسوں پر سوار ہو گئی اور اس وقت تک سوار رہی جب تک امیتا نے نیچے سے ہانک نہیں لگائی۔

”میں نے کہا میں نے تو صرف پرکولیٹر منگایا تھا، تم خود کافی بنانے بیٹھ گئے کیا؟“

امیتا کے لہجے میں فطری خوش مزاجی سے پیدا ہونے والی شوخی تھی مگر اجیت کے دل میں چھپے چور نے اس کو گھور کر دیکھا۔ یہ خوش مزاجی سچی ہے یا جھوٹی۔ جملہ کھرا ہے یا طنز میں ڈوبا ہوا۔ اس کا ذہن ترازو لے کر امیتا کو تولنے لگا۔ وہ پرکولیٹر لے کر کچن میں گھس گئی۔

”سنو میتو! مسز کھنہ پوچھ رہی تھیں کہ آپ کی مسز نے انٹیریئر ڈیکوریشن میں کوئی ڈپلومہ لیا ہے کیا۔ آپ کا گھر بے حد سلیقے سے سجایا ہوا ہوتا ہے؟“

امیتا کا مسرور چہرہ کچن سے جھانکا۔ اجیت نے اطمینان کا سانس لیا۔ بھگوان تیرا شکر ہے۔ عورت بنائی تھی سو بنائی تھی لیکن اگر اسے عقل بھی دے دی ہوتی تو مجھ جیسے مردوں کو تو مر جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہتا۔ اطمینان کا سانس لیتا ہوا وہ تولیہ اُٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ جسم پر صابن رگڑتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ مسز کھنہ کی بے تکلفی کو کس خانے میں فٹ کرے۔ محض خوش مزاجی، صاف دلی یا کہیں کہیں ان کے دل میں بھی نرم گوشے جاگ رہے ہیں۔ اجیت کے دل میں انار چھوٹنے لگے۔ صابن رگڑ رگڑ کر اس نے آدھا کر دیا۔ وہ تو شاید پورا ہی گھس دیتا اگر امیتا کافی تیار ہو جانے کی اطلاع نہ دیتی۔

قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ اجیت نے نرمی سے سوئی ہوئی امیتا کے بازو گلے سے ہٹاتے ہوئے سوچا۔ دیکھیں گے اس ہانڈی کا قورمہ کیسا ہے۔ وہ اپنی باریک تراشی ہوئی مونچھوں میں مسکرایا۔

صبح اجیت کی آنکھ کھلی تو امیتا چائے کی ٹرے لیے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ بستر کے پاس تپائی رکھ کر اس نے چائے رکھی اور نازک سنہری پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی۔ اجیت کا ڈریسنگ گاؤن اس کے سرہانے ٹنگا ہوا تھا۔ سلیپر مسہری کے نیچے موجود تھے۔ امیتا کے چہرے پر بڑی میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔ رات کی تلخ گفتگو وہ یکسر بھول چکی تھی۔ اس کے تازے شیمپو کیے ہوئے بالوں سے ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ اجیت نے پھر اپنے اوپر لعنت بھیجی۔ کیسی اچھی بیوی ہے۔ بھلا میں کہاں پرائی عورت کے چکر میں پڑ رہا ہوں۔ لیکن چائے پی کر نیند کا خمار اُترا تو حواسوں پر وہی آٹھ انچ گہرے بلاؤز کا گلا ناچ گیا مسز کھنہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لان پر کھڑی تھیں۔

"میں نے کہا اجیت جی! شام کو فرصت ہو تو چائے اوپر ہی پی لیجیے گا۔ کھنہ صاحب آج ٹور پر جا رہے ہیں، مجھے تنہا چائے پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

اجیت کو لگا کہ اس کے سر پر ایسا بم پھٹا جس میں رنگ برنگے تارے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سارے تارے اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھرک رہے تھے۔

"آپ آ رہے ہیں نا؟" مسز کھنہ نے سوال دُہرایا۔

"شام کو امیتا کی سہیلی کی شادی کی سال گرہ ہے، ہم دونوں وہاں مدعو ہیں۔" اجیت بڑی مری ہوئی آواز میں بولا۔

وہ اپنی نقرئی ہنسی ہنس کر بولیں :

"تو یہ تقریب تو امیتا جی کی سہیلی کی ہوئی۔ آپ کی سہیلی کی تو نہیں —— آپ انھیں جانے دیجیے۔ ہم لوگ چائے پئیں گے۔"

اجیت بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا۔ یہ سوا نیزے پر آیا ہوا آفتاب اس کے سر پر گر رہا ہے کیا؟ شام کو اجیت نے سر درد کا بہانہ کر لیا اور ثبوت کے طور پر وہ امیتا کو دکھا کر اے۔ پی۔ سی کی دو ٹکیاں اکٹھی کھا گیا۔

"میتو ڈارلنگ! تم چلی جاؤ۔ ان کی شادی کی پہلی سال گرہ ہے۔ تمھارا جانا بھی ضروری ہے۔ میں ذرا آرام چاہتا ہوں۔ کچھ Nausea بھی معلوم ہو رہا ہے ——"

امیتا کا سادہ سا چہرہ فکر سے بھر اٹھا۔ دوپہر میں کیا کھایا تھا؟ آفس کینٹین سے کچھ الٹا سیدھا لے لیا ہو گا۔ میں نے جو چکن سینڈوچ دیے تھے وہ بدمعاش انور کھا گیا ہو گا۔ تم فوراً ڈاکٹر سکسینہ کو فون کر لو۔ تم بھلا کیا کرو گے، میں ہی کیے دیتی ہوں۔ زیادہ تکلیف ہو تو میں بھی نہیں جاؤں۔" وہ حسبِ عادت ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

مارے غصّے کے اجیت کی مونچھیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اس کا بس چلتا تو امیتا کی ایک ایک بوٹی علیحدہ کر دیتا۔ ناک الگ، کان الگ، آنکھیں الگ، بازو الگ اور سب کو بالکل علیحدہ علیحدہ دفن کرتا تاکہ وہ کبھی ایک جگہ ہو کر پھر امیتا کی شکل اختیار نہ کر سکیں۔

غصّہ دبا کر جلدی سے بولا:

"نہ نہ۔ تم ضرور جاؤ ڈارلنگ۔ میں صرف ہنگامے سے بچنا چاہتا ہوں۔ سر میں درد کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔" پھر بائیں آنکھ دبا کر بولا۔ "ویسے رُکنا چاہو تو رک بھی سکتی ہو۔ ہم بھی آج اپنی شادی کی سالگرہ منالیں۔ بالکل دُلہن نظر آرہی ہو۔"

امیتا فکر بھول کر ہنسنے لگی:

"بدمعاش! اچھا آرام کرو۔" اور ایک ہوائی بوسہ پھینکتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی اجیت نے کمبل پھینکا۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور حسبِ معمول ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔

ڈرائنگ روم میں سناٹا تھا۔ ڈرائنگ روم سے متصل بیڈ روم سے مسز کھنہ کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی:

"بالم آئے بسو مورے من میں۔"

اس نے پکارا "شیلا جی!"

"یس۔ کم اِن۔" کھنکتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

وہ جھجکا۔ ان کے بیڈ روم میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا۔

"آئیے بھئی کیا سوچ رہے ہیں؟" کھڑکی کا پردہ اُٹھا۔ مسز کھنہ کی ناک کی لونگ جگمگائی۔

اجیت اندر داخل ہوا۔ کمرے کی ہر چیز میاں بیوی کے نفیس ذوق اور آرام طلب مزاج کی غماز تھی۔ اس نے ایک نظر مسز کھنہ پر ڈالی۔ وہ بے نیازی سے بالوں میں برش پھرا رہی تھیں۔ تقریباً بیک لیس چولی سے ان کی سنہری کمر جھانک رہی تھی۔ اجیت پر پھر وہی دورہ پڑا۔ جی چاہا انھیں چھو کر دیکھے۔ کچھ لوگ اصلی نہیں معلوم ہوتے۔ تخیل کا واہمہ محسوس ہوتے ہیں۔

"آپ کی خاطر میں نے امیتا کو تنہا ہی بھیج دیا۔" اجیت "آپ کی خاطر" پر زور دیتا ہوا بولا۔

"تھینک یو اجیت جی! آپ بے حد اچھے انسان ہیں۔ بے حد اچھے۔ یقیناً آپ کی بیوی خوش قسمت

ہے جو اسے آپ جیسا شوہر ملا۔ ایک کھنہ جی ہیں، روز ٹور، روز ٹور۔ پتہ نہیں یہ سارے ٹور آفیشل ہوتے بھی ہیں یا پردۂ زنگاری میں کسی معشوق کو چھپا رکھا ہے۔ اجیت کی تعریف کرتے ہوئے مسز کھنہ کی آواز میں طنز کا شائبہ بھی نہ تھا۔ بے حد اپنائیت تھی اور وہ بے حد قریب آ کر سیدھے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ اس کو اپنے چہرے پر ان کی سانسوں کے لمس کا احساس ہوا اور اس کے اندر خون شراب بن کر جھاگ دینے لگا۔

عورت اور مرد کے اس ازلی رشتے کا یہ کمزور لمحہ کب اور کیسے ان کے درمیان سرک آیا۔ اجیت کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ جب مسز کھنہ کے بازو اس کے گلے سے علیحدہ ہوئے تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ہارا ہوا جواری ہے۔ مسز کھنہ کا کاجل پھیل گیا تھا۔ اڑے ہوئے پاؤڈر کے دھبے برص کے داغ لگ رہے تھے۔ لپ اسٹک ہونٹوں کے درمیانی حصے سے غائب ہو کر باچھوں میں بھر گئی تھی۔ ان کے چہرے پر وہی طمانیت تھی جو موٹا سا چوہا پا جانے والی بلی کے چہرے پر ہوتی ہے۔

بڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اجیت نے سوچا کہ یہ عورت اُسے اسقدر انوکھی، اچھوتی، آسمان سے اُتری مخلوق کیوں معلوم ہوئی تھی۔ یہ عورت جو کسی بھی عام عورت سے الگ نہیں ہے کیا یہ چُرایا ہوا سُکھ امیتا سے ملنے والے سُکھ سے کچھ الگ تھا؟ حساب لگایا تو سارے جمع، ضرب، تقسیم کا جواب ایک ہی آیا۔ پھر بھلا چھ مہینوں سے اس نے اپنی نیندیں کیوں حرام کر رکھی تھیں؟ محض بند لفافے کو کھولنے کے لیے؟ ایک بیمار سے تجسّس کی تسکین کے لیے؟ یا اس لیے کہ وہ ایک ناقابلِ حصول شئے معلوم ہوتی تھی اور اجیت کے لیے ایک چیلنج۔ اسے امیتا یاد آئی جواب آتی ہی ہوگی۔ ایک سیدھی سادی معصوم سی گھریلو بیوی جسے وہ پچھلے چھ مہینوں سے ٹھگتا آ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور ان کے ڈریسنگ گاؤن ان پر ڈالتا ہوا نظریں چار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

پارٹی سے لوٹ کر رات کو جب امیتا میک اپ اُتارنے کے بعد اپنے بالوں کو کس کر چوٹی میں گوندھ رہی تھی تو اجیت نے اپنا چہرہ اس کے شانوں میں ڈبوتے ہوئے کہا:

"میتا! اِن بالوں کو کھلا ہی رہنے دو۔"

یہ ایسے ہی اچھے لگتے ہیں۔ پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں ہے؟

احمد یوسف

صد ہزار قصّے

دفتر کے لیے خاصا دوڑتا بھاگتا نِکلا تھا۔ سڑک پر بھی میری رفتار کافی تیز تھی، لیکن میدان میں پہنچ کر میں سُست رفتار ہوگیا۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔

دراصل میدان میں قدم رکھتے ہی دفتر دکھائی دینے لگتا ہے اور مَیں سوچتا ہوں کہ بس ایک ہی جست میں دفتر کے اندر ہوں گا، ابھی تو پورے پانچ منٹ باقی ہیں۔

مَیں آہستہ آہستہ میدان کی روش پر چل رہا تھا۔ ایسے وقتوں میں مَیں سوچتا ہوں، دفتر میری نگاہوں کے دائرے میں ہے، اور وقت میری گرفت میں ہے ——— مکمّل اطمینان اور آسُودگی کا احساس ——— جب کبھی ان لمحوں کا سامنا ہو تو آدمی بڑا فلسفی ہو جاتا ہے اور بہت کچھ سوچنے لگتا ہے۔

کنارے کھڑے درختوں کی چھاؤں ——— اُن سے پرے جا بجا بچھی ہوئی بنچیں کہ جن کے نیچے مُونگ پھلی کے چھلکوں اور چاٹ کے پتّوں کا ڈھیر ہے ——— قریب ہی پھُولوں کی کیاریاں ——— اس دُنیا کی اندرونی پرت تو سُست رفتار خیالوں کے قبضے میں رہی ہے۔

دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ گھر کے قصّے، دفتر کے، دوستوں کے اور پھر اسی دُنیا کے ———

تب ہی اچانک میری نظر روپے کے ایک سکّے پر پڑی، جو روش کے کنارے میدان میں پڑا تھا۔ مَیں نے اردگرد کا جائزہ لیا کہ وہاں کوئی ہے تو نہیں۔ پتہ چلا کہ اگر نزدیک و دور کچھ لوگ ہیں بھی تو وہ اس دلفریب منظر سے قطعی بے تعلق سے ہیں۔ یہ سوچ کر مَیں نے چُپکے سے اس چمکتے ہوئے شاہزادے کو اپنی جیب میں بسا لیا۔

لیکن پھر ایک رَو آئی وہ لوگ جو مجھ سے دُور تھے اور وہ لوگ جو مجھ سے قریب تھے، بظاہر تو اس چمکتی شے سے بے پروا تھے، مگر کیا پتہ ان میں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو، اور یوں وہ اس ایک روپے کے سکّے میں میرا حصّہ دار بن جائے۔ سو عافیت اسی میں ہے کہ کچھ آگے چل کر اس رُخِ روشن کی زیارت کی جائے۔

چند قدم آگے چل کر مَیں نے گھڑی دیکھی۔ دفتر کو تین منٹ اور تھے ـــــ ابھی وقت ہے۔

یہ سوچ کر مَیں نے جیب سے وہ روپیہ نکالا اور وہیں کنارے کی بنچ پر بیٹھ گیا مَیں نے غور سے دیکھا تو اس کی چمک کم ہوتی دکھائی دی، وہ خاصا بھدا بھی تھا۔ اور جب میں نے اسے سیمنٹ کی بنچ پر سجایا تو وہ چاروں ہاتھ پاؤں سمیٹ کر دھپ سے وہیں بیٹھ گیا۔ "خدا کے لیے مجھے نہ چھیڑو۔"

مجھے کچھ شبہ ہوا۔ کچھ تو ناچتا گاتا، تالیاں بجا کر شور مچاتا۔ یہ تو بس ایک کریہہ آواز نکال کر بیٹھ گیا۔

گھڑی کہہ رہی تھی ـــــ صرف ڈیڑھ منٹ اور ـــــ غور و فکر کا یہ دفتر بھی دفتر ہی میں کھولنا۔

دفتر پہنچ کر مَیں نے اپنی جیب کی تلاشی لی تو معلوم ہوا کہ روپے کے اس سکّے کے علاوہ جیب میں ایک روپے کے دو ایک نوٹ اور کچھ ریزگاری پڑی تھی۔ ایک روپے کا کوئی دوسرا سکّہ میرے پاس تھا ہی نہیں کہ مَیں اس نئے سکّے سے اس کی صورت ملاؤں۔ تب ہی مَیں نے سنگھ، پرشاد، ورما، نبی اور احمد سے دریافت کیا کہ کیا ان کے پاس کوئی ایک روپے کا سکّہ ہے۔

آخر شرما کے پاس ایک روپے کا سکّہ مل گیا۔ مَیں نے ہر طور پر اس سکّے کو شرما کے سکّے سے ملایا، لیکن اس میں شرما کے سکّے جیسی تڑپ، چمک دمک اور گھن گرج نہیں تھی۔

میرے دل نے سوال کیا "یہ سکّہ آخر ہے کیا؟

دوستوں نے کہا "کسی نہ کسی طرح تو چل ہی جائے گا۔"

کسی نے پھنسایا تمھیں؟

“کہیں بھیڑ بھاڑ میں چلا دینا۔ سینما کا ٹکٹ کاؤنٹر بہتر ہوگا یا پھر بس میں بھی چل سکتا ہے۔”

گویا اس میں خود چلنے کی طاقت نہ تھی، وہ دھکّے دے کر چلایا جائے گا۔

کمار اینڈ کمار جنرل اسٹور سے اگر کپڑے دھونے والے صابن کی ایک بٹّی لی جائے تو اس سکّے کے ساتھ دس پیسے اور دینے ہوں گے۔ لیکن اگر یہ سکّہ پہچان لیا گیا تو پھر مجھے نوٹ دینا ہوگا۔ اور صابن کی ایک نئی بٹّی میں پرسوں ہی خرید چکا ہوں۔ اگر یہ سکّہ چل جائے تو ایک فاضل بٹّی میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر نہ چلا تو؟ ــــــ یوں بھی آپ کے پاس صابن کی ایک بٹّی کے رہتے ہوئے دوسری آجائے، تو آپ پہلی کے استعمال میں وہ احتیاط نہیں برتتے، جو دوسری کے نہیں ہونے پر برتتے ہیں۔

دراصل ہم لوگ ایک چھوٹے سے دائرے کے لوگ ہیں۔ ساری زندگی ہم ایک ہی فن کی مشق کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے قدم اس دائرے سے باہر نہ نکلیں۔

لیکن میری جیب میں جو دو ایک نوٹ پڑے تھے، ان کی طاقت پر وہ سکّہ چل سکتا تھا، یعنی یہ کہ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ اگر وہ نہ چلا تو پھر میں نوٹ بڑھا دوں گا۔

کسی فائدے کے لیے کچھ نہ کچھ خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔

سینما کا ایک روپے پندرہ پیسے والا کاؤنٹر، جو ایک مصروف ترین کاؤنٹر ہوتا ہے اور جس کے آگے ایک دُور تک بل کھاتی ہوئی قطار ہوتی ہے، اور وہ اسے تیزی سے چھوٹا کرتا جاتا ہے ــــــ اس پر تو یہ سکّہ چل جائے گا۔

لیکن اس کاؤنٹر پر دو افراد ہوتے ہیں۔ ایک نوٹ لیتا ہے اور دُوسرا نوٹوں اور سکّوں کی جانچ پڑتال کرتا جاتا ہے۔ اگر اسی نے میرا سکّہ بجا کر دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟ ــــــ پھر وہی میرا نوٹ کام آئے گا۔

تب ہی ساری پکچریں میرے سامنے آگئیں کہ جن کے متعلق میں نے تبصرے پڑھے تھے اور جن کے متعلق میں نے دوستوں سے بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ کچھ پکچروں میں گھوڑے دوڑتے تھے، کچھ میں کاریں دوڑتی تھیں اور کچھ میں آدمی دوڑتے تھے۔ بھاگ دَوڑ سے بھاگ کر جاؤ بھی تو وہی بھاگ دوڑ ــــــ”

یہ صحیح ہے کہ اگر یہ سکّہ چل جائے تو یہ بھاگ دَوڑ بھی گوارا، ورنہ میرا نوٹ ہر حال میں قیمتی ہے۔"

"چاٹ ہاؤس" میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے، وہاں یہ سکّہ چل سکتا ہے، لیکن اگر نہ چلا تو اتنی مہنگی چاٹ پیٹ میں پہنچ کر فتنہ بپا کردے گی۔ فٹ پاتھ پر خوانچے والے سے چاٹ لو تو ایک روپے میں خاصی ہو جاتی ہے مگر چاٹ ہاؤس میں تو۔۔۔۔ ۔۔۔۔"

ایک روپے کا سکّہ میری جیب میں پڑا تھا۔ میز پر فائلیں بکھری پڑی تھیں، اور سامنے ایک سوالیہ نشان دیر سے کھڑا بسور رہا تھا ـــــ "کیا کیا جائے اِس سکّے کا؟"

کسی اسٹور میں چلانے جاؤ، تو پہچان لینے پر وہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا ـــ

"بابو جی ذرا اِسے بدل دیجیے۔"

لیکن اس کی مسکراہٹ کتنے ہی قصوں کو اپنے دامن میں چھپائے بیٹھی ہوگی۔

"بابو جی یہ سب ہم سے ہی کرنا تھا"

بابو آپ بھی ویسے ہی نکلے۔"

پھر "یہ سب" کے بھی کتنے ہی رُخ تھے اور "ویسے ہی" کے بھی سینکڑوں پہلو تھے۔

یہ سکّہ تو مجھے کھُلے بندوں ننگا کردے گا۔

ویسے وہ یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ مَیں نے بھی کسی سے دھوکہ کھایا ہوگا، مگر لوگوں نے تو اب اس طور سے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

اگر میری اُنگلی کٹ جانے سے چند قطرے خون کے میرے دامن پر گر جاتے ہیں تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ مَیں نے کسی پر چاقو چلایا ہوگا، تب ہی میری اُنگلی بھی زخمی ہوئی اور دامن پر خون کے دھبے بھی پڑے۔

ہر شخص یہی سمجھے گا کہ خود مَیں نے یہ سکّہ ڈھالا ہے۔

یہ سوچ کر میرے دل میں خوف کی ایک لہر سی دَوڑ گئی، آخر مَیں نے اس بے جان سکّے کو میدان سے اُٹھایا ہی کیوں تھا۔

کتنے ہی ہاتھوں سے گذر کر یہ سکّہ مجھ تک پہنچا ہوگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ شخص جس نے اِسے

ایک بند کہانی بنا کر میدان میں پھینک دیا تھا، مجھ سے کہہ رہا ہے

"یہ ایک ایسی دولت ہے، جو تردّدات کی فصل اُگاتی ہے، کچھ یہی سوچ کر میں نے اسے خاک کے سپرد کر دیا تھا۔"

پر یہ کہ اس ایک سکّے میں (جو مجہول سا تھا اور جو ناچنا گانا نہیں جانتا تھا) یہ صفت تھی کہ اگر وہ چل گیا تو منفعتوں کی ایک چھوٹی سی فہرست بنائی جا سکتی ہے (جن پر میں نے بہت کچھ غور بھی کیا ہے اور ابھی بہت کچھ باقی بھی ہے)

بچّوں کے لیے مُونگ پھلی، بُھنے ہوئے چنے، رسیلی گنڈیریاں۔

جب تک میرے پاس نوٹ ہیں یہ سکّہ کمزور نہیں ہو سکتا۔

سکّے کا نکل جانا ہر حال میں فائدے کا سَودا تھا، لیکن اس کے چکّر میں نوٹ کا نکل جانا گھاٹے کا۔

یہ خوانچے والے کسی کا بھی خیال نہیں کرتے۔ میری یہ سفید پوشی آنکھ جھپکتے ہی خاک میں مِل سکتی ہے، اسی دن کی بات ہے۔ اس غریب بابو کا گریبان تھام لیا تھا —— شاید نوٹ پھٹا تھا یا شاید کچھ پیسے کم دے رہا تھا۔

اچانک ایسا محسوس ہوا کہ وہ سکّہ میرے ہاتھ سے کامیابی کے ساتھ دوسرے ہاتھ میں چلا گیا۔

کمار اینڈ کمار کا کاؤنٹر، کسی سینما کا ٹکٹ گھر، کوئی چاٹ ہاؤس، کوئی خوانچے والا، کوئی ریڑھی والا۔

لیکن دوسری ہی ساعت ایک مفلس و نادار میرے سامنے آ کر کہتا ہے

"خدا تمھاری سات پُشتوں سے سمجھے۔"

میرے اندر کے دونوں دریا سخت طوفان میں گھِرے تھے۔

سارے دن ایک بڑے دفتر میں ایک چھوٹا دفتر کُھلا رہا۔

دفتر سے واپسی میں دوستوں کے ساتھ چلتا ہوا بھی میں اکیلا تھا۔

میرے حصّے میں صابن کی ایک نئی ٹکیہ آ سکتی تھی۔ سینما کا ایک شو۔ چاٹ ہاؤس میں میری پسندیدہ مٹر کی چاٹ۔

لیکن پھر سارے منصوبے ایک گہرے دریا میں غرق ہو گئے۔

وہ ہر ہاتھ میں پہنچ کر ایک مسئلہ بن جائے گا۔

وہ ہر ہاتھ سے نکلنے کے بعد اپنے پیچھے فتح و نصرت کی ایک داستان چھوڑ جائے گا۔

تو کیا یہی فتح و نصرت ہے؟

دین محمد کے ورکشاپ کے سامنے پہنچ کر اچانک میرے قدم تھم گئے۔

خاں صاحب ذرا وہ لوہا کاٹنے والی قینچی دینا۔

گھر آ کر مَیں نے اس سکے کو کاٹ کر دو کر دیا۔

تب ہی میرے بچوں کے ہاتھ میں کٹے ہوئے دو چاند تھے، اور وہ خوش تھے کہ کھیلنے کو ایک چمکتی شے مل گئی۔

پبلیکیشنز ڈویژن
وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ ہند